قومی زبان

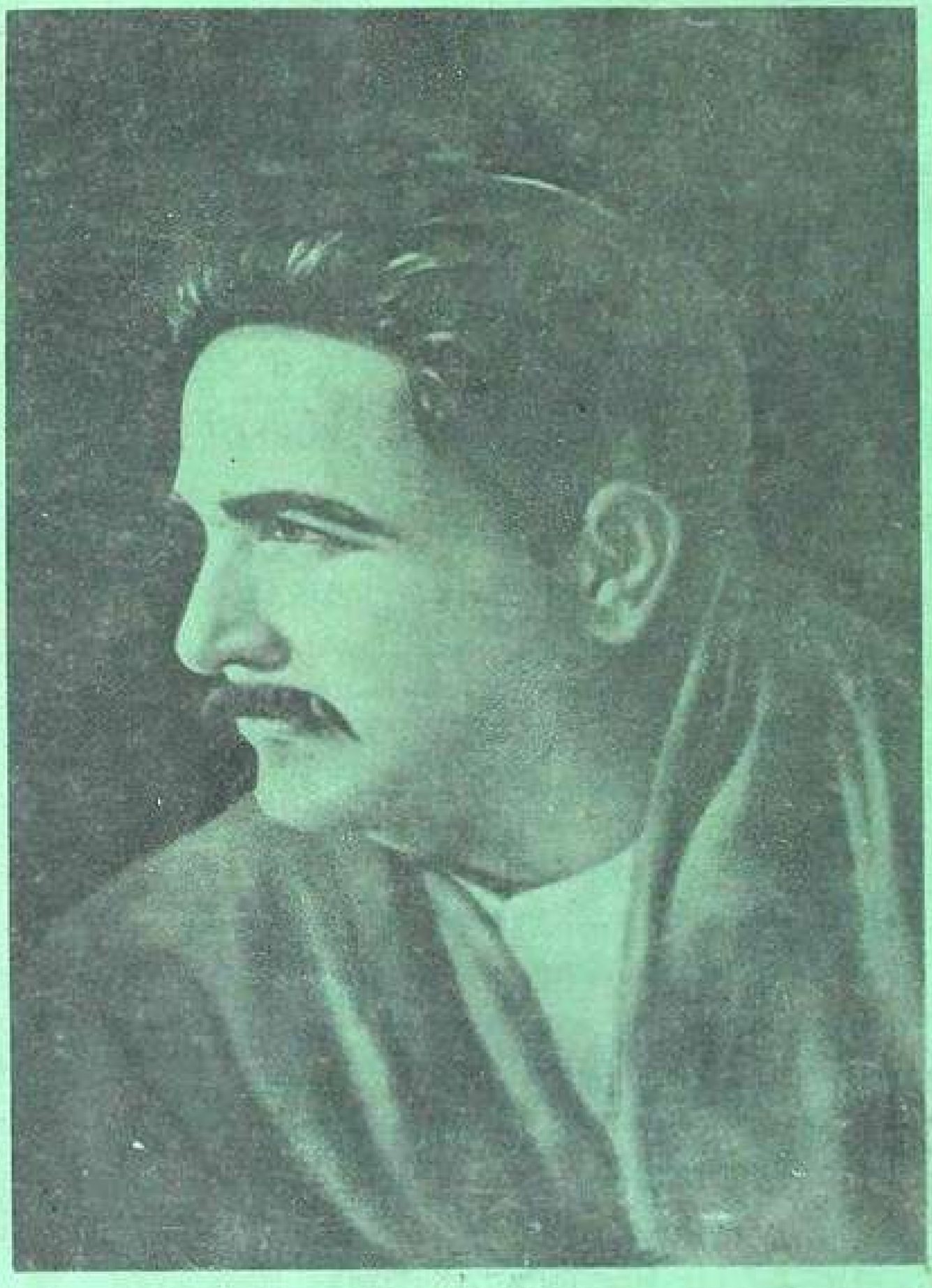

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی ۱

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

نومبر ۱۹۸۹

جلد: ۶۱

شمارہ: ۱۱

مضمون نما

ادارِیہ ۳
تیرھویں سیرت کانفرنس — صدرِ پاکستان ۵
اقبال فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید — احمد ہمدانی ۱۱
ڈاکٹر سید معین الحق — ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۹
اظہر بھائی — قاضی محمد اختر جوناگڑھی ۲۱
تصویر ۲۶
اوپندر ناتھ اشک - ایک تاثر — مختار زمن ۲۷
اوپندر ناتھ اشک — انور عنایت اللہ ۳۱
شیخ مہدی علی ذکی — ادا جعفری ۳۵
اردو ادب کی تاریخ کس طرح نہیں لکھی جانی چاہیے؟ — پروفیسر رالف رسل / سحر انصاری ۳۹
محمد حسن عسکری کے خطوط — آصف فرخی ۴۵
دکن کا ایک صوفی منش شاعر — سید تقی رضا بلگرامی ۳۵
ہندوستان میں اردو کو درپیش مسائل — چندن مترا ۵۹
مکتوبِ حجاز — (رپورٹ) ۶۳
گلہائے رنگ رنگ
گھر اور خاندان (بنگلہ کہانی) — راما ناتھ رائے / یاور امان ۶۵
نظمیں — رابندر ناتھ ٹیگور / جاوید دانش، آنا اخمتووا / ادیب سہیل، جوزف بروڈسکی / ابرار حسین ۷۰
کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ — ڈاکٹر انور سدید ۷۳
رفتارِ ادب ۸۱
گرد و پیش ۸۷
حروفِ تازہ ۹۱
نئے خزانے — ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری ۹۳

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

ادا جعفری

ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ...... ۵ روپے
سالانہ ...... ۵۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک

فی پرچہ ...... ایک ڈالر
سالانہ ...... دس ڈالر
سالانہ رجسٹری سے پندرہ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ، کراچی، فون: [illegible]

ہمارے اِس شمارے کا خصوصی مضمون شاعرِ مشرق علاّمہ اقبال سے متعلّق ہے۔ ۹ر نومبر علاّمہ اقبال کا یومِ ولادت ہے۔ ہماری قومی تاریخ میں یہ دن بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستان کا خواب دیکھنے والے مفکّر شاعر کا سفرِ زندگی اِسی دن سے شروع ہوا تھا۔ پورے ملک میں اِس دن خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ "قومی زبان" بھی اِس قومی خوشی میں برابر کا شریک ہے۔

پچھلے ماہ مشہور افسانہ نگار جناب اوپندر ناتھ اشک کراچی آئے، انجمن نے اُن کے اعزاز میں ایک بڑا جلسہ منعقد کیا۔ اِس جلسے میں جو مضمون پڑھے گئے تھے اسے ایک گوشے کی حیثیت دے کر شائع کیا گیا ہے۔

ہمیں بڑا افسوس ہے کہ پچھلے ماہ انجمن کے ایک سابق معتمد اعزازی ڈاکٹر سیّد معین الحق صاحب وفات پاگئے۔ ڈاکٹر صاحب اِن دنوں سیرتِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کام میں مصروف تھے اور ان کا خاتمہ بخیر ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بھی ایک خصوصی مضمون اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

تیرھویں سیرت کانفرنس

افتتاحی خطاب

صدرِ پاکستان غلام اسحاق خان

[کراچی میں ۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو تیرھویں قومی سیرت کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صدرِ پاکستان جناب غلام اسحاق خان صاحب نے جو تقریر کی تھی اسے ہم اپنے قارئین کے مطالعے کے لیے شائع کر رہے ہیں تاکہ "قومی زبان" کے قارئین بھی ذکرِ رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم میں شرکت کی سعادت حاصل کریں۔]

آج ہم فخرِ دو عالم، سرورِ کونین، رحمتِ عالم، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کے ذکرِ جمیل کی سعادت سے دلوں کی آسودگی، ذہنوں کی کشادگی اور روحوں کی بالیدگی حاصل کرنے جمع ہوئے ہیں۔ مدحتِ رسولؐ ہمارے لیے تکمیلِ ایمان کا ذریعہ اور نجات کا وسیلہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ ہماری زبان میں یہ قدرت ہے کہ ثنائے پیغمبرؐ کا حق ادا کر سکے اور نہ ہمارے تخیّل میں اتنی وسعت کہ مقامِ نبیؐ کا احاطہ کر سکے۔ مگر پھر بھی باری تعالیٰ سے یہی التجا ہے کہ اس عاجزانہ کوشش کے وسیلے سے ہمیں ان بندوں میں شامل کرے جن سے وہ راضی ہوا اور جن پر اس نے اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دیے۔

حاضرینِ گرامی قدر!

روزِ آفرینش سے آج تک ایسا کوئی دن طلوع نہیں ہوا جو ۱۲ ربیع الاوّل سے زیادہ سعادت و برکت کا دن ہو۔ یہ دن تخلیقِ کائنات کے درجۂ کمال کا دن ہے۔ یہ اعلائے کلمۂ حق کی ابتدا اور کفر و باطل کے ایوانوں کے لرزنے کا دن ہے۔ یہ انسانی حرّیت کے نقطۂ آغاز اور انسانی محکومی کی جملہ روایات کی تنسیخ کا دن ہے۔ یہ اس عظیم ہستی کی بعثت کا یومِ سعید ہے جس نے نسلی غرور اور قومی تفاخر کے بُت گرا دیے اور روندی ہوئی انسانیت کو مساوات اور امن کا لافانی منشور عطا کیا۔ جس نے صداقت کو زبان بخشی اور کذب و افترا کے اسباب مٹا دیے۔ یہی وہ مقدّس ترین دن ہے جب ارض و سما پر محیط ظلمتیں سمٹ گئیں اور لطفِ الٰہی سے وہ آفتابِ تازہ طلوع ہوا جس کے لازوال نور میں انسان ذلّت و نامرادی

اور مایوسی کی پستیوں سے اٹھ کر عزّت و اقبال اور یقین کی رفعتوں پر فروکش ہوا اور وہ "ولقد کرمنا بنی آدم" کے اعزاز کا سزاوار بنا۔

سامعینِ کرام،

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، نبی مکرّم ؐ کے حُسنِ ظاہری اور جمالِ معنوی، ان کے اعجازات و احسانات اور سیرتِ طیّبہ، جو سر تا قدم قرآن کی تفسیر ہے، اتنے وسیع، اتنے عمیق موضوع ہیں کہ مجھ جیسا عاجز بیاں اور شکستہ پا اس دبستانِ لامتناہی میں قدم تک رکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ یہ آپ جیسے اہلِ علم و دانش کا میدان ہے اور مجھے امید ہے کہ ان موضوعات پر آپ کی عالمانہ گفتگو رشد و ہدایت کی روشنی پھیلانے کا وسیلہ بنے گی۔

میں تو آج آپ کی اجازت سے صرف چند سوال اُٹھانے کی گستاخی کروں گا..... چند ایسے سوال جو رحمۃ اللعالمینؐ کا اُمتی ہونے کے ناطے ہم میں سے ہر کسی کو اپنے آپ سے پوچھنے چاہئیں۔ چند ایسی باتیں جو انسانیت کے عظیم ترین محسن کے نام لیواؤں کی اس خداداد مملکت کے حوالے سے ذہن میں آتی ہیں اور خون کے آنسو رُلا جاتی ہیں۔

جب مجھے یہ بتایا گیا کہ موجودہ سیرت کانفرنس کا موضوع "پیغمبرِ امن و اخوت" ہے تو میرا ذہن معاً "اسلام" کے لغوی معنی کی طرف گیا۔ اسلام، یعنی سلامتی۔ پھر نگاہوں میں اقوامِ عالم کا اجمالی خاکہ پھرنے لگا جس میں گو کہ بہتری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں مگر پھر بھی اب تک بحیثیتِ مجموعی بدامنی اور بے چینی کا رنگ غالب ہے۔ کہیں نظریات کے تصادم سے اور کہیں مفادات کے ٹکراؤ سے۔ کہیں طاقتور کی بالادستی اور غلبہ حاصل کرنے کی خواہش جارحیت کی نت نئی شکلوں کو جنم دے رہی ہے اور کہیں کمزور کی بے بضاعتی اور بے بسی عارضی تحفّظ کی پناہ گاہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ مختلف میدانوں میں فتوحات انسانوں کو فرعونوں کا غرور عطا کر کے امن کی بجائے انتشار اور نفرت کو جنم دے رہی ہیں اور چاند کی پُرسکون سطح پر قدم رکھنے والا انسان حیران ہے کہ جنون کی اتھاہ اسے کب یہ محسوس ہونے دیں گے کہ زمین پر سلامتی ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ یہ کہ ایسا صرف تبھی ہوگا جب آدمی کا بنایا ہوا وہ نظام بدلے گا جو بھیڑوں کی حفاظت بھیڑیوں کے سپرد کرتا ہے اور جب ہر اس بُت کا طلسم توڑ دیا جائے گا جس کی خدائی میں انسانیت کے اُبھرنے کا امکان نہ ہو۔ امن کا راز کسی ایک انسان، کسی ایک قوم، کسی ایک ملک کے دوسرے انسان، دوسری قوم، دوسرے ملک پر فتح میں نہیں بلکہ تمام انسانوں پر کسی ایسے نظام کی بالادستی میں ہے جو طاقتور کو کمزور کی حفاظت اور نگہبانی سکھاتا ہو، جو کجکلاہوں کو فروتنی بخشتا ہو، جہاں مظلوموں کی زبانیں فریاد کے لیے نہیں، تشکّر کے لیے کھلی ہوں، جو ہر محمود کو ایازوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہو، جو بھوک سے مرنے والے کُتے تک کی ذمّے داری قبول کرتا ہو۔ وہ نظام جو دو عالم کے لیے رحمت بن کر آنے والی انسانیت کے محسنِ اعظم نے عطا کیا ہے۔ یہ وہی نظام ہے جس کی دعوت لے کر اٹھنے والوں سے دنیا کی امامت کا وعدہ کیا گیا ہے اور کُل روئے ارض پر جس کے نفاذ کی سعی کو اہلِ ایمان کے لیے جہاد ... دیا گیا ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا آج ہم اس امامت کے حق دار ہیں؟ ہم خود اپنے بارے میں لاکھ حُسنِ ظن سے کام لیں، اس سوال کا جواب نفی ہی میں ملے گا۔

ایسا کیوں ہے؟ وہ عزت و شرف والے کہ کل تک جن کی جناب میں گستاخیِ فرشتہ بھی پسند نہ تھی، آج تحقیر کا ہدف کیوں ہیں؟ وہ، سلامتی جن کا دین ہے اور امن جن کا جزوِ ایماں، آج انتشار، بے چینی اور بدامنی کا شکار کیوں ہیں؟ یہ کیوں کر ہوا کہ جنھیں ایک دوسرے کی جان و مال اور آبرو کا محافظ بنایا گیا تھا، آج آپس میں دست بہ گریباں، برادر کشی میں مصروف ہیں؟ یہ سب نتیجہ ہے اس بدبختی کا کہ ہم نے نہ صرف دین و ایمان کی صراطِ مستقیم سے انحراف کیا بلکہ غلاموں نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم تک کو بھلا دیا۔ ان کی مدح میں رطب اللسان تو ضرور رہے مگر دلوں کو ان سے وابستہ نہ کر سکے جو اللہ سے نزدیک ہونے کا واحد ذریعہ ہیں، اپنے آپ کو انھیں سے دور کر لیا۔ نتیجتہً وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ جب مصطفیٰ ؐ تک رسائی حاصل نہ کر سکے تو پھر بولہبی کے سوا کیا ملتا ہے؟

ہمیں حکم ہوا کہ "پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ"۔ ہم دائرۂ اسلام میں آ تو گئے مگر ایسا نظر آتا ہے گویا دل و دماغ کو باہر ہی چھوڑ آئے۔ ہمیں تو رسالت مآب ؐ کے طفیل آگ کے گڑھے کے کنارے سے لا کر باہم شیر و شکر کر دیا گیا تھا۔ پھر آج ہم میں تفرقہ کیوں ہے؟ خدا کے رسول ؐ نے تو ہمیں حجۃ الوداع کے موقع پر تاکید کی تھی کہ "یاد رکھو، تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو تم پر اسی طرح حرام ہے جیسے تمہارے اس شہر میں آج کے دن حرمت ہے یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو"، کیا ہمیں آقائے دو جہاں ؐ کا یہ حکم یاد رہا ہے؟ یا ہم یہ فرض کر بیٹھے ہیں کہ ہمیں نہ اپنے رب سے جا ملنا ہے اور نہ اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے؟

ہمیں سمجھایا گیا تھا کہ "پورا مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا سے تمام مسلمان محفوظ ہیں"، پھر بتائیے کہ جب ہماری زبانیں اور ہمارے ہاتھ روزِ قیامت ہمارے اعمال کی گواہی دیں گے تو ہم اسے کیا منھ دکھائیں گے جس کی شفاعت کے ہم طلب گار ہیں؟ فرمایا تھا: "میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو"، گویا مسلمانوں کے باہمی کشت و خون کو کفر کے مترادف گردانا گیا۔ اب وہ جو اس جرمِ قبیح کا ارتکاب کرتے ہیں، اپنے آپ کو کس منھ سے مسلمان کہیں گے؟

حضورِ اکرم ؐ نے اپنی زبانِ مبارک سے اللہ کا یہ فرمان بھی ہم تک پہنچایا تھا کہ "اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے۔ تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا"، مگر بندوں کی سرکشی دیکھیے کہ جو بات معبود نے حرام قرار دی اسے اپنے آپ پر حلال کر کے معمول بنا لیا۔ اگر نہیں تو پھر ہم آئے دن شعلوں میں گھرے مکان، نقاب پوشوں کے ہاتھوں بے گناہوں کا قتل، بے گور و کفن لاشیں اور بچی ہوئی ردائیں دیکھنے پر کیوں مجبور ہیں؟ اور پھر بھی دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں!

ہمارے تمام مسلمانوں کے ضرور ہیں۔ ہم میں سے اکثر نماز روزے کے بھی پابند ہیں اور صدقات و خیرات بھی دیتے ہیں مگر ہم جس کے اُمتی ہیں وہ تو کہتا ہے کہ "جس آدمی میں یہ تین باتیں نہ ہوں اس کا کوئی عمل کام نہ آئے گا۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے نفسانی جذبات کی باگ ڈھیلی نہ ہونے دے۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی نادان حملہ کرے تو وہ تحمل سے خاموش ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ لوگوں کے درمیان حسنِ اخلاق کے ساتھ زندگی بسر کرے"۔ کیا ہم اس معیار پر پورا

اُتر تے ہیں؟ ہماری جذباتیت کا تو یہ حال ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور بے بنیاد افواہوں پر مشتعل ہو کر عقل و خرد کو خیر باد کہہ بیٹھتے ہیں۔ تحمّل کا یہ عالم ہے کہ چھوٹی سی بات بھی اگر ناگوارِ خاطر ہو تو بھڑک اٹھتے ہیں حالانکہ دَم اس کی محبّت کا بھرتے ہیں جس نے پتھر برسانے اور کانٹے بچھانے والوں کو بھی دعائیں دیں۔ رہا حُسنِ اخلاق، تو دل آزاری کی وہ کون سی قسم ہے جو ہم میں نہیں پائی جاتی؟ دل آزاری، ناراضگی کا سبب بنتی ہے اور اخوت کے رشتوں کو کمزور کر دیتی ہے اور ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ وقتی ناراضگیوں کو دائمی کینہ بنا کر پالتے ہیں اور جب دلوں میں کینہ آجائے تو محبّت مفقود ہو جاتی ہے جب کہ محبّت، شفقت اور رحمت ہی تو آقائے دو جہاںؐ کا پیغام ہے اور وہ دن اللہ تعالیٰ کے سایۂ رحمت کا ایک وسیلہ ہے جس دن اس کے سوا کوئی اور سایہ نہیں ہو گا۔

اب اگر ہم ربِّ غفور الرّحیم کے سایۂ رحمت کے طلب گار ہیں تو ہمیں باہمی محبّت کو فروغ دینا ہو گا، نفرتوں اور تعصّبات کے بُتوں کو مسمار کرنا ہو گا اور ہر اس شے، ہر اس جذبے کی بیخ کنی کرنی ہو گی جو ہم میں تفرقہ ڈال کر باہمی آویزشوں اور منافرت کا سبب بنتی ہے۔

باہمی نفاق کی متعدد وجوہ گنوائی جا سکتی ہیں۔ مگر اس کا سب سے بڑا سبب خدا اور اس کے رسولؐ سے سرتابی ہے۔ مومن تو ارشادِ ربّانی کے مطابق آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اب اگر وہ اپنے ہی وطن میں، جس کو اسلام کا قلعہ کہتے نہیں تھکتے، بھائیوں کی طرح نہیں رہ سکتے تو اس سے بڑھ کر ایمان کی کمزوری کا ثبوت اور کیا ہو گا؟ یہ اس امر کا بھی شاخسانہ ہے کہ ہم نے شافعِ محشرؐ کا عطا کردہ اکسیر تو طاقِ نسیاں پر رکھ چھوڑا ہے اور نو آموز عطائیوں کے مہمل نسخوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ نتیجۃً مادہ پرستی، روحانیت پر غالب آگئی ہے اور انسان بے اطمینانی اور مایوسی کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ کیفیت کبھی تشدّد کے بہانے تلاش کرتی ہے اور کبھی مرکز گریز تنظیموں کا روپ دھار لیتی ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہر منفی تنظیم اپنے وجود کے لیے چند دلائل تو ضرور رکھتی ہے لیکن ان دلائل کی لگائی ہوئی آگ بجھائے نہیں بجھتی۔

کہا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں در آنے والے نفاق کے پیچھے دشمن کا ہاتھ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا ہو مگر سوال تو یہ ہے کہ ہمارا حفاظتی حصار اتنا کمزور کیسے ہو گیا کہ دشمن ہماری صفوں میں آبیٹھا؟ اگر ہم متحد ہوں تو دشمن کے ناپاک عزائم اور سازشوں کے باوجود محفوظ و مامون رہ سکتے ہیں، لیکن اگر ہمارا اتحاد کمزور پڑ جائے تو دشمن کی ظاہراً نیک خواہشات بھی ہماری بقا کی ضمانت نہیں بن سکتیں۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام کا سیاسی فلسفہ وحدت، مرکزیت اور اجتماعیت کے جن اصولوں کے گرد گھومتا ہے، وہی اصول ہماری قومی یک جہتی کو درپیش ہر چیلنج اور دشمن کی ہر چال کا منھ توڑ جواب ہیں اور ہمیں اسی سبق کو عام کرنا ہے۔

اسلام ہمارا دین ہی نہیں، ہمارے قومی وجود کا جواز بھی ہے۔ ہم ہر دور میں اسلام سے اپنی غیر مشروط وابستگی کا اظہار تو کرتے رہے ہیں، لیکن جیسا کہ میں نے حال ہی میں ملتان میں کہا تھا، "اس کے باوجود اسلام ملک میں آج بھی عملاً طاق پر رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ ہونے کو تو پاکستان اسلامی جمہوریہ ہے اور اس کے آئین کی روح بھی اسلامی ہے۔ زبان سے ہر کوئی لا الٰہ الا اللہ کا ورد بھی کرتا ہے مگر افسوس کہ دل و نگاہ مسلماں نہیں۔ سوچ کے انداز، عمل کے طور طریقے

مومنانہ نہیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہم اپنی قومی زندگی کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دے رہے اور نہ ہی اسلامی قدروں کو پروان چڑھانے میں خاطر خواہ دل چسپی لے رہے ہیں۔ ہم نے دوسری ترجیحات کو کچھ اس طرح اپنے اعصاب پر سوار کر لیا ہے کہ نفاذِ اسلام کے لیے عملی اقدامات تو در کنار، زبانی جمع خرچ میں بھی بخل سے کام لینے لگے ہیں۔"

ہمیں یہ روش بدلنا ہوگی اور تبھی ہم قوم کو امید کا پیغام دے سکیں گے۔ اس سلسلے میں حکومت کے ساتھ ساتھ علماء، مشائخ اور دانشوروں پر بھی ذمّے داری عائد ہوتی ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ اس ذمّے داری سے پہلوتہی نہیں کریں گے۔ معاشرے میں پھیلے ہوئے لسانی، گروہی، علاقائی اور فرقہ وارانہ تعصّبات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفرتوں، تصادم، بغض و عناد اور اسلامی مساوات اور عدل و احسان کے فقدان کو دیکھ کر مایوس ہونا یوں تو فطری امر ہے لیکن ہمارے عقیدے کے مطابق مایوسی گناہ ہے کیونکہ پروردگار کی رحمت بے کنار اور اس کا کرم بے حساب ہے۔ چنانچہ قوم کے ہر فرد سے میری درخواست ہے کہ تمام تر مشکلات کے باوجود وہ یہ نہ سوچے کہ وہ بے بس ہے۔ احساسِ بے بسی اپنی انتہائی شکل میں بے عملی کا سبب بنتی ہے۔ ہر اس شخص کو جو اسلام اور پاکستان سے محبت رکھتا ہے، چاہیے کہ اپنی روز مرہ زندگی اور اپنے ذاتی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی معاملات میں اس محبت کا عملی ثبوت پیش کرے اور صرف مسلمان، حضورؐ کا غلام اور پاکستانی کہلائے اور تبھی یہ ممکن ہو گا کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس نہج پر ڈال سکیں جو ان رحمتوں، برکتوں اور عظمتوں کی طرف جاتی ہے جو کملی والےؐ کے غلاموں کا مقدّر ہیں۔ خدا اپنے حبیب کے صدقے میں ہمیں اس کی توفیق عطا کرے۔ آمین!

میں اپنی کم مائیگی کے اعتراف کے ساتھ اس دعا پر اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں کہ جن مقاصد کے لیے وزارتِ مذہبی امور نے اس کانفرنس کا اہتمام کیا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں پورا کرے اور مسلمانانِ پاکستان کو امن و اخوت کی فضا اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ انہی الفاظ کے ساتھ میں اس قومی سیرت کانفرنس کا افتتاح کرتا ہوں۔

اسلام زندہ باد   پاکستان پائندہ باد

ابنِ انشا کی حیات اور ادبی خدمات پر ایک اہم دستاویز

ابنِ انشا

احوال و آثار

مصنّف: ڈاکٹر ریاض احمد ریاض

قیمت: ۱۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

احمد ہمدانی

اقبال ۔ فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید

خیال انگیزی اور خیال افروزی علامہ اقبال کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان کی تمام شعری تخلیقات ایک بامعنی انبساط کے ساتھ ہمیں دعوتِ فکر دیتی نظر آتی ہیں جب کہ ان کی نثری تصنیفات و پیش دینی، تہذیبی اور معاشرتی مسائل پر براہِ راست روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کی نثری تصانیف میں "فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید" کے عنوان سے انگریزی زبان میں ان کے خطبات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علامہ نے اپنے ان سات خطبات میں اُمتِ مسلمہ سے متعلق دینی اور دنیوی مسائل کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور مسلمانوں کی سوچ پر پڑی ہوئی گردِ زمانہ کو صاف کر کے اسلامی تصورات کے اصل خدوخال کو نمایاں کرنے کی سعیِ بلیغ سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ان خطبات میں قرآنِ پاک، احادیثِ شریفہ، مسلم مفکرین اور فقہا کے کارناموں کو سامنے رکھ کر اسلامی تعلیمات کی روح کو دریافت کیا ہے۔ وہ بالطبع فکری اور تجزیاتی رویہ کے حامل دانشور تھے، چنانچہ ان خطبات میں ان کی تجزیاتی صلاحیت بہت اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ بہت سے مسائل کا تجزیہ کر کے وہ ایسے نتائج اخذ کرتے ہیں جو اُمتِ مسلمہ میں مروّج و مقبول نظریات کی نفی کرتے ہیں اور کیونکہ ان نظریات کا تعلق مذہب سے ہے، چنانچہ علما کی ناراضگی کا خطرہ مول لیے بغیر ان کو بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ علامہ نے یہ خطرہ مول لیا اور حق و صداقت کی خاطر خود کو سخت آزمائشوں میں ڈالا۔

پچھلے سال پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی نے ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا جس میں علامہ کے مذکورہ خطبات کو مطالعہ کا موضوع قرار دے کر ملک کے نامور دانشوروں کو دعوت دی تھی کہ وہ علامہ اقبال کے خطبات کے تناظر میں فکرِ اسلامی پر گفتگو فرمائیں۔ اس سیمینار میں سینٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، پروفیسر وارث میر، جسٹس (ریٹائرڈ) قدیر الدین احمد، ڈاکٹر منظور احمد، مولانا محمد طاسین، پروفیسر محمد منوّر، پروفیسر پریشان خٹک، پروفیسر محمد عثمان اور پروفیسر کرار حسین نے حصّہ لیا۔ پروفیسر پریشان خٹک کے انتہائی مختصر مضمون کے علاوہ سب کے مقامین نہایت محنت اور توجہ سے لکھے گئے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں تفہیمِ اقبال کے سلسلے میں نہایت مفید ثابت ہوں گے۔

اقبال کی فکر کو سمجھنے کے لیے اسلامی فکری تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس عمل کو ہم تفہیمِ اقبال

کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ کام ڈاکٹر حسین جعفری نے بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی مقالہ میں فکرِ اسلامی کے ارتقا کی تاریخ پر نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے جس کی وجہ سے علامہ اقبال کے خطبات کی صحیح معنویت دریافت کرنے اور علامہ کے فکری پس منظر سے واقف ہونے کے لیے ڈاکٹر سید حسین جعفری کا یہ مقالہ کلیدی اہمیت کا حامل ٹھہرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ علامہ کے خیالات و تصورات کے پس منظر سے آگہی کے بغیر ان کے نظریات کی صحیح تفہیم میں طرح طرح کی دشواریوں اور ان کی تفسیر و تعبیر میں قدم قدم پر لغزشوں کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ڈاکٹر جعفری صاحب نے لغزشوں کے ان امکانات کو دور کرنے کی کوشش کے ساتھ اقبال فہمی کے لیے راستہ ہموار کرتے ہوئے عہدِ رسالت سے بیسویں صدی تک فکرِ اسلامی کے ارتقائی سفر کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے اس ارتقائی سفر کو اسلام کے داخلی اور خارجی محرکات کے تناظر میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ:

(۱) عہدِ رسالت میں اسلامی فکر کی اساس وحی ہے اور یہ پورا دور انقلاب یا FAITH IN ACTION کا دور ہے۔

(۲) عہدِ رسالت کے بعد خلفائے راشدین کا زمانہ ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے دورِ جمع و تلاش اور انطباق یعنی PERIOD OF COLLECTION AND APPLICATION کہا ہے۔ اجتہاد کی بنیاد اسی دور میں ڈال دی گئی تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام نے بدلتے ہوئے حالات کے تحت جگہ جگہ اجتہاد سے کام لیا ہے۔ اس طرح اجتہاد اسلامی فکر کا بنیادی عنصر ہے۔

(۳) خلافتِ راشدہ کے بعد تیسرا دور اموی عہد سے شروع ہو کر آلِ سلجوق کے برسرِ اقتدار آنے پر ختم ہوتا ہے۔ اس عہد میں مختلف دبستانِ فکر وجود میں آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس دور کو محرکات و مقتضات اور ان کے اجوابات کا دور یعنی PERIOD OF CHALLENGES AND RESPONSES کہا ہے۔ یہ دونوں چار سو سال پر محیط ہے اور تدوینِ حدیث، تفسیرِ قرآن، فقہ، اصولِ فقہ، کلام، تصوف، فلسفہ، ادبیات، تاریخ اور علم الرجال وغیرہ اسی دور کی پیداوار ہیں۔ ان علوم کے ارتقا کے پسِ پشت داخلی اور خارجی دونوں طرح کے چیلنج موجود تھے جن کی وضاحت ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے میں کی ہے۔ داخلی چیلنجوں کے تحت مرجیہ، قدریہ اور جبریہ مدرسہ ہائے فکر پیدا ہوئے جن کی مختصر وضاحت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے خارجی حالات کے تحت اسلامی فکر کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔

(۴) اسلامی سلطنت کی حدود پھیل جانے کے بعد مسلمانوں کو مختلف مذہبوں اور فلسفوں سے واسطہ پڑا اور طرح طرح کے سوالات کے جواب مہیا کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ یعنی اب خالص اور سادہ مذہبی فکر کے بجائے مخالفین کو عقلی سطح پر قائل کرنے کے لیے عقلیت پسند دبستان کی بنیاد ڈالی گئی۔ معتزلہ مسلمانوں کا پہلا عقلیت پسند دبستان ہے۔

(۵) معتزلہ کی عقلیت پسندی کا بنیاد پرست لوگوں پر شدید ردِ عمل ہوا اور پانچواں مدرسۂ فکر اشاعرہ وجود میں آیا۔

(۶) اشاعرہ کے بعد حضرت امام غزالی نے معیار بندی STANDARDIZATION سے کام لیتے ہوئے مختلف دبستانوں کے معیاری اصولوں کو تسلیم کر کے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو دُور کیا۔ امام غزالی کے اس عظیم کارنامے کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب ہوئے جس کی وضاحت ڈاکٹر صاحب کے مقالے میں بحُسن وخوبی کی گئی ہے۔

یہ سب دبستان تاریخِ اسلامی کے چوتھے دَور یعنی آلِ سلجوق کے برسرِ اقتدار آنے تک کے زمانے پر محیط ہیں۔ فکرِ اسلامی کا پانچواں دَور سلجوقیوں کی حکومت میں چھٹی صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کو ڈاکٹر صاحب نے تقلیدِ محض کا دَور بتایا ہے جس میں فکرِ اسلامی اپنی اجتہادی روح سے محروم نظر آتی ہے۔

اسلامی فکر کے اس عروج وزوال کو سامنے رکھتے ہوئے علّامہ نے روحِ اجتہاد کو از سرِ نو بحال کرنے پر زور دیا ہے۔ ڈاکٹر جعفری کا مقالہ پڑھنے کے بعد ہمیں علّامہ کے خیالات کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ابتدائی خطبہ کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال کا مضمون ہے جسے سمینار کا کلیدی مقالہ بنایا گیا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے "اقبال اور عصرِ جدید میں اسلامی ریاست کے تصوّر" پر علّامہ اقبال کے خطبات کے تناظر میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے سب سے پہلے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید سے متعلق علّامہ کے خطبات پر مشتمل کتاب کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ علّامہ اقبال برِّصغیر میں اصلاحات کی اس تحریک کا حصّہ ہیں جس کا آغاز شاہ ولی اللہؒ نے کیا اور شاہ صاحب کے بعد جس تحریک کے نمایاں لوگوں میں سرسیّد احمد خاں اور مولانا شبلی شامل ہیں۔ علّامہ کے نزدیک مسلم معاشرے کو تین منفی قوتوں سے سخت نقصان پہنچا ہے اور وہ منفی قوتیں ملوکیت، ملّائیت اور تصوّف ہیں۔ اس طرح انھوں نے پستی میں گری ہوئی اُمّتِ مسلمہ کو "کُشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری" کہہ کر خطاب کیا ہے چنانچہ وہ ملّائیت کے مقابلے کے لیے اسلام کی تشریحِ جدید علم الکلام کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح تصوّف سے بے عملی کو خارج کر کے اس کو اصل اسلامی خطوط میں ڈھالنے پر زور دیتے ہیں اور اسلام کے علاقائی تشخص کے لیے اسلامی ریاست کے قیام کو ضروری ٹھہراتے جہاں ملوکیت کی جگہ جمہوریت کو دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ وہ شوکت یعنی طاقت کو اسلام کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ شوکت کے بغیر ان کے ہاں اسلام کا کوئی تصوّر تھا ہی نہیں، تو یہ خیال بہت حد تک درست ہوگا۔ ان ہاں مسلم قوم کا تصوّر اشتراکِ ایمانی سے وابستہ ہے نہ کہ اشتراکِ وطن سے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے معاشرے کی تشکیل کے سلسلے میں علّامہ کی اصطلاحات کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ علّامہ جسے ملّائیت کہتے ہیں وہ دراصل اسلام کا روایتی نقطۂ نگاہ ہے۔ وہ جسے پیری سے تعبیر کرتے ہیں وہ عوامی اسلام ہے اور پاکستان کو وجود میں لانے والے ان کے نزدیک اصلاحی اسلام کے قائل تھے۔ پاکستان میں جو معاشرتی کشمکش جاری ہے وہ ان ہی تین طبقوں کے درمیان ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کا خیال ہے کہ علّامہ کے نزدیک جمہوریت تعلیماتِ قرآنی کے عین مطابق

ہے، کیونکہ قرآنِ پاک کی بیالیسویں سورۃ کی اڑتیسویں آیت میں خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہ ہیں جو باہم ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں۔ اس آیت مبارکہ سے موجودہ اسمبلی کا جواز فراہم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انتخاب کا عمل اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور اسمبلی میں قانون بنانا ایک طرح اجماع کی نئی صورت ہے۔ ڈاکٹر جاوید مزید بتاتے ہیں کہ علامہ نے جدید اسلامی ریاست کے لیے تین بنیادی اصول وضع کیے تھے جو درج ذیل ہیں۔

(۱) پہلا اصول اتحادِ انسانیت یعنی HUMAN SOLIDARITY

(۲) دوسرا اصول مساوات یعنی EQUALITY

(۳) اور تیسرا اصول ہے حرّیت یعنی FREEDON

علامہ کے بتائے ہوئے ان تین اصولوں میں کہیں بھی مسلمان اور غیر مسلمان کی قید نہیں ہے۔ گویا اسلام مذہب کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کا بالکل قائل نہیں ہے۔ چنانچہ مسلم ریاست کا فرض ہے کہ وہ عدل قائم کرے۔ فقہ کے سلسلے میں بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ ضرورت پڑنے پر ہمارے فقہا نے قرآنی احکام کی تشریح و تعبیر میں وقت کے تقاضوں کا خیال رکھا ہے۔ اسلام کی یہی خوبی ہے جو اسے ہر عصر میں بامعنی رکھتی ہے۔ اسلام میں یہ خوبی اس کے اصولِ اجتہاد کا ثمرہ ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کے بعد ڈاکٹر سیّد احمد جالندھری کا مضمون ہے جس میں انھوں نے اسلامی قانون کے ارتقا میں اجتہاد کے کردار کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے حضرت امام غزالی کے بعد سے اجتہاد کا دروازہ خود پر بند کر لیا ہے۔ ان کا یہ عمل قرآنِ پاک کی واضح تعلیمات، حضور نبی کریمؐ کی احادیث اور خلفائے راشدین و صحابۂ کرام کے طریقے کے برعکس ہے۔ قرآنِ پاک جگہ جگہ عقل سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ حضور نبی کریمؐ کی زندگی میں کئی واقعے ایسے ہیں جہاں احکامات کے لفظی معنی کے بجائے اس کی روح پر توجہ دی گئی، اسی طرح خلفائے راشدین کے دور سے بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں قرآنی آیات کے ظاہری معنی سے انحراف کر کے اس کی روح اور اصل مقصد کے مطابق عمل کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید فرمایا کہ خود ائمۂ فقہ میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان کے تشریحات کے بعد لوگ اپنی عقل کا استعمال نہ کریں اور ہر طرح کے اجتہاد سے باز رہیں۔ اجتہاد کے دروازے بند کر لینا ہماری اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہے جس کے مضر اثرات برداشت کرتے پڑ رہے ہیں۔ علمائے کرام نے صحابۂ کرام کے اجتہادات کے تین درجات مقرر کیے ہیں۔ یعنی قرآن و سنّت کی تشریح و تفسیر کے سلسلے میں اجتہاد، کسی زیرِ بحث مسئلہ کو کتاب و سنّت میں موجود کسی ملتے جلتے مسئلہ پر قیاس کرنا، کسی خاص معیّن نصّ پر اعتماد کرنے کے بجائے روحِ شریعت پر اعتماد کرنا۔ علما کا خیال ہے کہ شریعتِ مقدّسہ کا مقصد مخلوق کی بھلائی ہے۔ جس جگہ یہ بھلائی پائی جائے گی وہی شریعت ہوگی۔ اس اصول کے تحت اسلام میں اجتہاد سے کام لیا جاتا رہا اور ایک خلیفہ راشد نے دوسرے خلیفہ راشد کی رائے پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھا اور اپنے خیالات کے مطابق اجتہاد سے کام لیا۔ حضور نبی کریمؐ اور صحابۂ کرام کا یہ طریقہ علامہ کے پیشِ نظر تھا اور وہ خود بھی ایک صاحبِ بصیرت دانشور تھے۔ چنانچہ انھوں نے مسلم

رہنماؤں کو مشورہ دیا ہے:

"عہدِ حاضر میں مسلم رہنماؤں کا فرض ہے کہ مغرب میں جو انقلاب رونما ہوا ہے اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں پھر پورے اعتماد (ضبطِ نفس) اور گہری بصیرت کے ساتھ اسلام کے منتہائے اہداف (ULTIMATE AIMS) کو بحیثیت ایک اجتماعی سیاست SOCIAL POLITY پیش کریں۔"

انھوں نے مزید فرمایا:

"قرآنِ مجید کی تعلیمات جو زندگی کو ایک ترقی یافتہ تخلیقی عمل گردانتی ہیں، یہ ضروری قرار دیتی ہیں کہ ہر نسل کو جو اپنے اسلاف کے (تخلیقی) کام سے روشنی حاصل کرتی ہے، اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ اپنے مسائل کو خود سلجھائے۔"

ڈاکٹر رشید صاحب فرماتے ہیں کہ اہلِ علم نے قانون سازی کے سلسلے میں کہا ہے کہ وقت کے بدلنے کے ساتھ احکامات بھی بدل جاتے ہیں۔ اس اصول کو تسلیم کرنا بلاشبہ ایک عظیم الشان اجتہادی عمل ہے۔ یہ عظیم الشان عمل اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ آخر میں ڈاکٹر رشید فرماتے ہیں:

"یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ عہدِ حاضر میں مجتہد کے لیے جہاں عربی زبان و ادب، قرآن و سنّت نصوص اور فقہی سرمایہ سے آگہی ضروری ہے وہاں عہدِ حاضر کے جدید سیاسی و اقتصادی افکار سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ جس طرح قرآن و سنّت کا علم رکھے بغیر اجتہاد کا دعویٰ مضحکہ خیز ہے، اسی طرح جدید فلسفۂ سیاست و معیشت سے آگہی کے بغیر تفقّہ و اجتہاد کا دعویٰ محلِ نظر اور خود فریبی کے مترادف ہے۔"

ڈاکٹر رشید جالندھری کے مضمون کے بعد پروفیسر وارث کا مقالہ ہے جس کا عنوان ہے "عصرِ حاضر کے تقاضے ــ اقبال اور اجتہاد"۔ انھوں نے اپنے مقالے کے بالکل شروع میں علّامہ ابنِ قیّم کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی کتاب "اعلام الموقعین" کا ایک اقتباس پیش کیا ہے جس میں وہ شریعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شریعت از سر تا پا عدل، رحمت، مصالح اور حکمت ہے۔ جو مسئلہ عدل سے نکل کر ظلم اور رحمت سے نکل کر زحمت اور مصلحت سے نکل کر فساد اور حکمت سے نکل کر بیہودگی بن جائے وہ شریعت نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ تاویلات کے سہارے اسے شریعت میں داخل کر لیا گیا ہو۔"

اس کے بعد انھوں نے علّامہ اقبال کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جو مولوی ظفر احمد صدّیقی کے نام لکھا گیا تھا اور جس میں شریعت کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے۔

"اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے

حدود متعیّن کرتا ہے۔ ان حدود کے متعیّن کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔"

شریعت کی اس تعریف کے بعد پروفیسر وارث میر نے علّامہ اقبال کے خطبات میں درج شاہ ولی اللہ کا یہ قول پیش کیا ہے۔

"پیغمبر کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور اسے ایک عالم گیر شریعت کے لیے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقۂ کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لیے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی مقصود بالذّات نہیں۔ انھیں آیندہ نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔"

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ اجتہاد اسلام کی روح ہے اور اسلامی قانون سازی میں اجتہاد کا کردار بہت اہم ہے۔ اسی طرح جسٹس قدیر الدّین احمد نے بھی عہدِ حاضر میں اجتہاد کی ضرورت پر بڑے مدلّل انداز میں روشنی ڈالی ہے اور اپنے استدلال میں قرآن، سنّت اور صحابہ و فقہا کے طریقوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ مولانا محمد طاسین نے اپنے مقالہ تغیّر پذیر معاشرے میں شریعت کے کردار پر روشنی ڈالی ہے اور اپنی بحث کو ختم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"جب تک معاشرے کی بڑی اکثریت کے ذہنوں میں ایمانی عقائد کی بنیاد پر وسیع و عالم گیر قسم کے اخلاقی جذبات و احساسات پیدا نہ ہو جائیں جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ عدل و انصاف کرنے پر اُبھارتے ہیں اور جب تک معاشرہ اپنی معاشی ضروریات کے لحاظ سے خود کفیل اور سیاسی اعتبار سے کامل طور پر آزاد و خود مختار نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے بعض دفعہ اس میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ لہٰذا تاوقتیکہ وہ مذکورہ دینی اور خارجی حالات معاشرے میں پیدا نہ ہو جائیں۔ اس درمیانے وقت کے لیے شریعت اس معاشرے کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ ایک طرف ایسا تعلیمی نظام رائج کرے جس سے ذہنوں میں ایمانی عقائد کے ساتھ بنی نوع انسان کی ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ اور عدل و انصاف کا ہمہ گیر احساس و داعیہ پیدا ہو سکے اور دوسری طرف وہ معروف طور طریقے اختیار کرے جو معاشی خود کفالت اور سیاسی خود مختاری کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ تیسری طرف اجتماعی امور و معاملات میں نظم و ضبط قائم رکھنے اور کاروبارِ زندگی کو باقاعدگی کے ساتھ چلانے کے لیے عبوری قوانین وضع کرے

جو قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہوں اور جن پر عمل سے اجتماعی حالت نسبتاً سدھر اور کچھ نہ کچھ بہتر ہو سکتی ہو اور شریعت کے حقیقی و مثالی اصول و احکام کے عمل میں آنے کی منزل قریب تر ہو سکتی ہو اور کیونکہ عبوری قانون سازی کا تعلق معاشرے کے تغیّر پذیر حالات سے ہوتا ہے جو کچھ نہ کچھ بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا عبوری قانون سازی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس طرح معاشرے کی تغیّر پذیری کے سبب اجتہاد سے کام لینا لازمی ٹھہرتا ہے۔"

پروفیسر محمد منوّر نے بھی "علّامہ اقبال اور اصولِ حرکت" کے عنوان سے اجتہاد کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے اور پروفیسر عثمان نے "سرمایۂ اجتہاد میں اقبال کا حصہ" کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ اجتہاد کو بالعموم قانون سازی تک محدود کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کا دائرۂ کار پوری زندگی پر محیط ہونا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں:

"ثبات و تغیّر کے درمیان توازن اور دوام و تبدیلی کے مابین محکم رشتے کی تلاش جو اجتہاد کا جواز اور مقصود ہے، کیا فقط قانون کے ساتھ محدود و مختص ہے یا اس کی ضرورت پوری زندگی کو ہے۔"

وہ آگے چل کر کہتے ہیں:

"اب ضرورت ہے کہ اجتہاد پر قانون و ضابطہ سازی کی اجارہ داری اور قبضے کو ختم کر کے پوری انفرادی اور قومی بلکہ بین الاقوامی زندگی کے پس منظر میں اس کا جائزہ لیا جائے۔"

اسی طرح پروفیسر کرّار حسین اپنے مقالے میں اجتہاد کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اجتہاد کی بابت میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں علم عمرانیات (SOCIOLOGY) سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ جس طرح آسمانی کتاب اسی زبان میں اترتی ہے جو ان لوگوں کی زبان ہوتی ہے جو اس دین کے مخاطبِ اولیٰ ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کے معاشرتی پس منظر کو نظر میں رکھنا ہوگا۔ تاریخ کی حرکیت کے تحت یہ تمام چیزیں بدلتی چلی جاتی ہیں۔ (عمرانی روایات، انداز اور رسوم و رواج) اب دیکھنا یہ ہے کہ سوسائٹی کے اندر کوئی خاص حکم جو آیا ہے اس کا رلم کیا ہے، اس کی سمت کیا ہے اور اپنی موجودہ سوسائٹی کے اندر ان باتوں کو ہم کس طرح پورا کر سکتے ہیں، اس حکم کی روح اور اصل اصول کو کس طرح اپنے حالات پر منطبق کر سکتے ہیں ——— بس یہی چیز اجتہاد ہے۔"

یہ تو سیمینار میں شریک دانشوروں کے مقالات کا سرسری خلاصہ تھا۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا صدارتی خطبہ دیا گیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے فکرِ اقبال اور تنقیدی مطالعہ کی اہمیت پر زور دیا ہے اور وہ کہتے ہیں:

"دنیا اب بہت آگے نکل چکی ہے۔ یہ صورتِ حال وقت کے ساتھ ساتھ اور نمایاں ہوگی اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ آنے والے زمانے کے لیے ہم مسائل پر از سرِ نو غور کریں

نئے سوالات اٹھائیں اور ان کے جوابات تلاش کریں۔ اجتہاد کا مسئلہ بھی اسی لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔"

الغرض زیرِ نظر کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے اور منقولات کے دام میں گرفتار ہماری قوم کو معقولات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ تقلیدی اندھیروں سے نکال کر ہمیں تخلیقی اُجالوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ اپنی ہمہ جہت افادیت و اہمیت کے اعتبار سے علامہ اقبال کے افکار کے سلسلے کے یہ مضامین اجتہاد کی اہمیت پر جس بھرپور انداز سے روشنی ڈالتے ہیں اس کی مثال مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

اقبال

مصنفہ: احمد دین (مصنف سرگزشتِ الفاظ)

مرتبہ: مشفق خواجہ

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی اور اس ایڈیشن کے تمام نسخے جلا دیئے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نئے ایڈیشن میں متن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے اور ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے تمام حذف شدہ مباحث اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتب نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں احمد دین کے حالاتِ زندگی ادبی کاموں اور علامہ اقبال سے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے

صفحات: ۵۲۸ قیمت: ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

ڈاکٹر اسلم فرّخی

ڈاکٹر سیّد معین الحق

اخبار میں بڑی چھوٹی سی خبر تھی۔ مشکل سے تین چار سطریں ہوں گی۔ مؤرخ کی وفات عنوان تھا۔ ظاہر ہے کہ اہلِ علم کے لیے تین چار سطریں ہی کافی سمجھی جاتی ہیں۔ روزناموں میں عالموں اور دانشوروں کے لیے اس سے زیادہ گنجائش کہاں۔ عالموں کے گزر جانے سے خبر کہاں بنتی ہے۔ یہ چھوٹی سی خبر ڈاکٹر معین الحق کے بارے میں تھی۔ جمعہ ۲۰ اکتوبر کو ڈاکٹر صاحب بھی رخصت ہو گئے اور ان کے ساتھ برّصغیر کی تاریخ کے مسلم عہد کے مطالعے۔ ذاتی محنت، دید و دریافت اور علمی لگن کی ایک روایت بھی ختم ہو گئی۔

ڈاکٹر سیّد معین الحق کا تعلق مراد آباد سے تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے۔ وہیں عرصۂ دراز تک شعبۂ تاریخ سے منسلک رہے۔ عہدِ سلطنت کی تاریخ کے بارے میں انھیں استناد کا مرتبہ حاصل تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد علی گڑھ سے کراچی آ گئے تھے۔ اردو کالج سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی انھیں کی کوششوں سے وجود میں آئی۔ وہ سوسائٹی کے معتمدِ عمومی اور ناظمِ تحقیق رہے۔ ۱۹۵۳ء سے سوسائٹی نے ایک تحقیقی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہی اس کے مدیر اور کرتا دھرتا تھے۔

ڈاکٹر سیّد معین الحق کی معتمدی میں ہسٹاریکل سوسائٹی نے تاریخ کے سلسلے میں بڑی مفید علمی خدمات انجام دیں۔ متعدد اہم کتابوں کی اشاعت ہوئی۔ بعض مشہور تاریخوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ ہسٹاریکل سوسائٹی نے یہ ساری خدمت بڑی خاموشی اور لگن سے انجام دی۔ ڈاکٹر معین الحق صلے سے بے پروا گوشہ نشین عالم تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی تاہم علمی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ہسٹاریکل سوسائٹی میں ڈاکٹر صاحب نے بہت محنت سے کام کیا۔ ان کاموں میں ذخیرۃ الخوانین (فارسی متن)۔ ابنِ سعد کی طبقاتِ کبیر کے بعض حصّوں کا انگریزی ترجمہ خافی خاں کی تاریخ کا انگریزی ترجمہ۔ برّصغیر میں اسلامی فکر اور تحریکیں۔ جیسی فکر انگیز کتابیں شامل ہیں۔

ضیاؔالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی کا اردو ترجمہ بھی ڈاکٹر صاحب کی ایک عمدہ یادگار ہے۔ چونکہ وہ بنیادی طور پر تاریخ کے اس عہد میں اختصاص رکھتے تھے۔ فارسی پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی۔ اس وجہ سے ان کا ترجمہ اور حواشی دونوں بڑے اہم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ضیا برنی کے محاورے اور آہنگ کو بڑی خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔

ان کا ایک مضمون "کیا محمد تغلق پدر کُش تھا" تحقیقی اعتبار سے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ بعد میں ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اپنی کتاب "ترکان قرونا" اور آغا مہدی حسین نے اپنے تحقیقی مقالے "محمد تغلق" میں اس مسئلے پر جو بحث کی، ڈاکٹر صاحب کے مقالے نے اس کی بنیاد فراہم کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک اور کارنامہ جو طالب علموں اور عام قارئین میں بڑا مقبول ہوا، برِصغیر کی تہذیبی۔ ثقافتی اور علمی تاریخ ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر اپنے اختصار کے باوجود تاریخ کے ایک بڑے عالم کے معروضی نقطۂ نظر اور وسعتِ مطالعہ کی حامل ہے۔

ڈاکٹر صاحب مثبت فکر اور عملِ پیہم کے حامل تھے۔ اردو اور پاکستان دونوں سے دلی لگاؤ تھا۔ تعلیمی مسائل و معاملات سے گہری دلچسپی تھی۔ مدّت تک کراچی یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کے رکن بھی رہے۔ کمیٹیوں میں وہ اپنی رائے کا بے لاگ اظہار کرتے تھے۔ ایک دفعہ سنڈیکیٹ میں ایک مسئلہ پیش تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے اس کے بارے میں گفتگو ہوئی تو کہنے لگے: "ہم اور آپ جن اداروں سے تعلق رکھتے ہیں ان کا مقصد انسانی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا اور بہتر انسانیت کا فروغ ہے۔ اگر ہم معاملات و مسائل میں اپنی رائے کا دیانت دارانہ اور بے جھجھک اظہار نہیں کریں گے تو ہمارے طالب علموں میں یہ جذبہ کیسے پروان چڑھے گا۔" ڈاکٹر صاحب کو تاریخی حوالوں پر بڑا عبور تھا۔ اس سلسلے میں وہ ایک عدیم النظیر شخصیت تھے۔ جب بھی کسی حوالے کے بارے میں دریافت کیا جاتا، پوری رہ نمائی کرتے تھے۔

ڈاکٹر سیّد معین الحق کو انجمن ترقی اردو پاکستان سے بھی تعلق تھا۔ انجمن کے ابتدائی دور میں اس کے معتمدِ اعزازی بھی رہے تھے۔ لیکن ہسٹاریکل سوسائٹی کی مصروفیت کی وجہ سے مستعفی ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر سیّد معین الحق کی ۸۸ سالہ زندگی کا بڑا حصّہ تحصیلِ علم اور ترویجِ علم میں گزرا۔ بے شمار طالب علموں نے ان کی رہ نمائی میں اپنا علمی سفر طے کیا۔ ان کی تحریروں اور کتابوں سے بے شمار قارئین نے استفادہ کیا۔ خرابیِ صحت کے باوجود وہ خاموشی اور لگن سے کام کرتے رہے۔ بڑے خلیق اور ملنسار انسان تھے۔ علمی تعاون میں پیش پیش رہتے۔ مستحقین کی امداد کرتے۔ جوہرِ قابل کو پہچانتے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ اُن کا آخری کام سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تھا۔ وہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کام کر رہے تھے۔ یوں اُن کا خاتمہ بخیر ہوا۔

اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

تنقید اور جدید اردو تنقید

مصنّف ــــ ڈاکٹر وزیر آغا

قیمت: ۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

قاضی محمد اختر جوناگڑھی

اطہر بھائی

سالِ وفات ۲۱ر نومبر ۱۹۸۰ء

۱۹۶۴ء کے موسمِ سرما کا ایک دن ـــــ عبیداللہ علیم اور میں اسلامیہ کالج سے حسبِ عادت زیلن کافی ہاؤس پہنچتے ہیں۔ کافی ہاؤس کے صدر دروازے پر ایک ٹیکسی آکر رکتی ہے۔ تین افراد اس ٹیکسی سے باہر آتے ہیں۔ یہ وقیسر مجتبیٰ حسین اور عزیز حامد مدنی کو میں شناخت کرتا ہوں۔ یہ دونوں حضرات ٹیکسی سے اُتر کر کافی ہاؤس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ تیسرے صاحب، عبیداللہ علیم کو اپنی جانب آتا دیکھ کر باہر ہی رُک جاتے ہیں۔ ہم دونوں ان کے نزدیک پہنچتے ہیں۔ علیم بڑی عقیدت اور احترام سے ان صاحب کو سلام کرتے ہیں اور ہاتھ ملاتے ہیں، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

"اختر اِن سے ملو یہ اطہر بھی ہیں اور نفیس بھی!"

میں ان سے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہوں ـــــ یہ اطہر نفیس تھے!

اسلامیہ کالج کی "بزمِ ادب" کے سالانہ مشاعرے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مشاعرے کی صدارت کے لیے فیض احمد فیض رضامند ہو گئے ہیں۔ میرے استاد پروفیسر ممتاز حسین مجھ سے کہتے ہیں۔ "دیکھو اطہر نفیس صاحب کو اس مشاعرے میں شرکت کی دعوت ضرور دینا۔ وہ جدید غزل کی ایک معتبر آواز ہیں۔" میں علیم سے کہتا ہوں" وہ یقین دلاتے ہیں۔ "تو فکر نہ کر یار! اطہر بھائی کو اس مشاعرے میں لانے کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔" اطہر نفیس اس مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں اپنی غزل پڑھتے ہیں۔

اطہر تم نے عشق کیا کچھ تم بھی کہو کیا حال ہوا
کوئی نیا احساس ملا یا سب جیسا احوال ہوا

ایک سفر ہے وادیِ جاں میں تیرے دردِ ہجر کے ساتھ
تیرا دردِ ہجر جو بڑھ کر لذتِ کیفِ وصال ہوا

عشق فسانہ تھا جب تک اپنے بھی بہت افسانے تھے
عشق صداقت ہوتے ہوتے کتنا کم احوال ہوا

راہِ وفا دشوار بہت تھی تم کیوں میرے ساتھ آئے
پھول سا چہرہ کمھلایا اور رنگِ حنا پامال ہوا

اطہر نفیس غزل کے ہر شعر پر فیض اور حفیظ ہوشیارپوری کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے شاعروں سے بھی بے پناہ داد وصول کرتے ہیں۔ دوسرے دن کالج کے بیشتر طالب علموں کی زبان پر ان کے اشعار تھے۔ اسلامیہ کالج کے شعبۂ اردو سے فارغ التحصیل طلبہ اپنے پروفیسر ممتاز حسین کی سرپرستی میں "انجمن فروغِ ادب" قائم کرتے ہیں۔ اطہر نفیس اس انجمن کی سالانہ شعری نشستوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں۔ نوجوان ان کے اشعار خصوصی توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔

یادوں کا سفر جاری ہے ——

کراچی سے شائع ہونے والے سہ ماہی ادبی جریدہ "سیپ" میں اطہر نفیس پر ایک خصوصی مطالعہ شامل ہے۔ مضمون نگاروں میں سلیم احمد، ساقی فاروقی اور عبید اللہ علیم ہیں۔ اطہر نفیس کی متعدد غزلیں بھی اس شمارے میں انتخاب کی گئی ہیں۔ وہ شمارہ میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔ میں اپنی ڈائری کھولتا ہوں۔ اطہر نفیس کہتے ہیں:

نہ منزل ہوں نہ منزل آشنا ہوں — مثالِ برگ اُڑتا پھر رہا ہوں
میں اس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں ہر سُو — جو مجھ سے کہہ سکے میں بے وفا ہوں
وہ ایسا کون ہے جس سے بچھڑ کر — خود اپنے شہر میں تنہا ہُوا ہوں
سُلا دو اے ہواؤ اب سُلا دو — بہت راتوں کا میں جاگا ہُوا ہوں

ہوائیں کس لیے نامہرباں ہیں — وہ میری نیند وہ راتیں کہاں ہیں
غنیمت ہے کہ اس دشتِ الم میں — تمہاری یاد کے کچھ سائباں ہیں

پھر کوئی نیا زخم نیا درد عطا ہو — اُس دل کی خبر لے جو تجھے بھول گیا ہو
اب دل میں سرِ شام چراغاں نہیں ہوتا — شعلہ ترے غم کا کہیں بجھنے نہ لگا ہو
کب عشق کیا کس سے کیا جھوٹ ہے یارو — بس بھول بھی جاؤ جو کبھی ہم سے سُنا ہو

جیسے کھو کر بہت مغموم ہوں میں — سُنا ہے اس کا غم مجھ سے سوا ہے
کچھ ایسے غم بھی ہیں جن سے ابھی تک — دلِ غم آشنا نا آشنا ہے
بہت چھوٹے ہیں مجھ سے میرے دشمن — جو میرا دوست ہے مجھ سے بڑا ہے
اکیلا ہوں بھری دنیا میں یارو — یہ میرے عہد کا اک سانحہ ہے

اسی زمانے میں اطہر نفیس ہندوستان چلے جاتے ہیں کچھ عرصے بعد کے ادبی ڈائجسٹ "نقش" میں سجاد ظہیر کا ایک مضمون شائع ہوتا ہے۔ الفاظ تو اب ٹھیک یاد نہیں رہے مفہوم البتہ یہ تھا: "اور اس کے بعد نفیس اطہر اپنی غزل سُنانے کے لیے مائک پہ آئے جسے بلاشبہ "خالص پاکستانی غزل" کہا جا سکتا ہے۔" غزل یہ تھی:

بے نیازانہ ہر اک راہ سے گزرا بھی کرو — شوقِ نظارہ جو ٹھہرائے تو ٹھہرا بھی کرو
اتنے شائستۂ آدابِ محبت نہ بنو! — شکوہ آتا ہے اگر لب پہ تو شکوہ بھی کرو
سینۂ عشق تمناؤں کا مدفن تو نہیں — شوقِ دیدار اگر ہے تو تمنا بھی کرو

وہ نظر آج بھی کم معنی و بیگانہ نہیں　　اس کو سمجھا بھی کرو اس پہ بھروسا بھی کرو

اطہر نفیس کا پہلا مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔ اردو غزل اپنے اعتبار کو شناخت کرتی ہے، اپنا گم شدہ لہجہ دریافت کرتی ہے۔ یہ غزل ایک تہذیب کی بازیافت ہے۔

میں اپنے عشق میں سچّا ہوں اور کہتا ہوں　　مری رگوں میں بہت زہر ہے رقابت کا

اطہر نفیس کے اشعار اب تک نئی نسل کے لیے ایک مثالیہ تھے۔ انھوں نے اس نسل کے خواب لکھے تھے۔ مگر اب ان کی آواز پاکستان کے گوشے گوشے میں پھیل رہی ہے۔ پھیل چکی ہے۔ ابھی اور پھیلے گی! ان کی یہ غزل اب ہر پاکستانی کے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہے:

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال بتائیں کیا　　کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں پھر سچّا شعر سنائیں کیا

ہم نغمہ سرا کچھ غزلوں کے ہم صورت گر کچھ خوابوں کے　　بے جذبۂ شوق سنائیں کیا، کوئی خواب نہ ہو تو بتائیں کیا

اس ملک کا ہر صاحبِ احساس فرد اب اطہر نفیس کے نام سے واقف ہے ـــــ ان کا احترام کرتا ہے ـــــ ماہنامہ "خنون" کے شمارے اکتوبر، نومبر ۱۹۷۸ء میں اطہر نفیس نے کہا تھا۔

"لفظ گونگے ہیں انھیں گویائی دینے کے لیے　　زندگی کے سچّے لمحوں میں غزل کہتا ہوں میں"

جل گیا سارا بدن اِن موسموں کی آگ میں　　ایک موسم روح کا ہے جس میں اب زندہ ہوں میں

اِن ہی موسموں میں ایک دن سرِ راہ ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ انور شعور میرے ساتھ ہیں۔ اطہر نفیس کو میں نے ایک طویل عرصے کے بعد دیکھا ہے۔ وہ خوش قامت تھے۔ خوش رو تھے۔ خوش گفتار تھے۔ خوش اطوار تھے مگر، مگر اس سہ پہر کو "جنگ" کے عین مقابل ایک پان فروش سے پان لیتے ہوئے جب میں انور شعور کے ہمراہ اُن سے ملا تو دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ کافی بدل چکے تھے۔ عمارت کا شکوہ اپنی جگہ برقرار تھا۔ ایسے لگا اندر کوئی دیوار منہدم ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے۔ وہ نحیف اور تھکے ہوئے دکھائی دیے۔ اکھڑے اکھڑے لہجے میں وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر ایک رکشہ میں بیٹھ کر چلے گئے۔

کچھ دنوں بعد معلوم ہوا "جنگ کا ادبی صفحہ" اب اطہر نفیس ترتیب دیں گے۔ ایک دن انور شعور کے ساتھ کسی کام سے ان کے دفتر گیا۔ وہ چشمہ لگائے بڑے انہماک سے اپنے کام میں مگن تھے۔ کچھ دیر بعد چشمہ اُتار کے ہم سے مخاطب ہوئے "میں ادبی صفحے میں کچھ تبدیلیاں لانا چاہتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ ادبی خبریں بڑی دل چسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔ لوگ انھیں شوق سے پڑھتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ "سُنا ہے" کے عنوان سے ادبی خبروں کا ایک نیا کالم شروع کیا جائے"۔ کچھ دیر بعد بڑی حلاوت بھرے لہجے میں بولے۔ "اختر یار دیکھو اگر تمھیں فرصت ہو تو ذرا یہ خبریں بنا دو" یہ کہہ کر

انھوں نے کوئی پانچ چھ مختلف ادبی خبریں مجھے بنانے کے لیے دیں۔ انور شعور تو کچھ دیر بعد وہاں سے چلے آئے لیکن میں وہاں بیٹھا رہا۔۔۔ اور پھر تقریباً ایک سال تک میں برابر ان کے پاس جاتا رہا۔۔۔ اب تک وہ میرے لیے صرف اطہر نفیس تھے۔ اب وہ میرے اطہر بھائی تھے۔

یادوں کا سفر جاری ہے ــــــــ

غالباً ۱۹۷۹ء کے موسم سرما میں اطہر بھائی اپنے عزیز کے ہاں اندرون سندھ گئے۔ وہاں جاکر ان کی حالت اور بگڑ گئی ــــــــ چند دنوں وہیں علاج کیا اور آخر کار کراچی واپس آگئے۔ کئی دنوں تک جب وہ دفتر نہیں آئے تو انور شعور اور میں ان کی مزاج پرسی کے لیے گھر پر گئے۔ اطہر بھائی بستر پہ لحاف اوڑھے بائیں کروٹ سے لیٹے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ اپنا احوال سنانے کے بعد اپنے میڈیکل چیک اپ کے مختلف کاغذات اور رپورٹوں کی ایک فائل دکھائی۔ یہ فائل کافی ضخیم ہو چکی تھی۔ اب اس میں مزید گنجائش نہ تھی۔ کہنے لگے گزشتہ دنوں ایک تازہ غزل کہی ہے۔ سنو! اس کے بعد یہ مطلع پڑھا:

چاروں سمت سمندر ہے　　　　پانی سر سے اوپر ہے

یہ گویا ایک اشارہ تھا جسے ہم دونوں سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس دوران میں ممتاز حسین صاحب بھی تشریف لائے۔ مختلف معاملات پر گفتگو ہونے لگی۔ ہم لوگ واپس آگئے۔ درمیان میں وہ پھر کچھ سنبھلے اور دفتر آنے لگے ـــ اور پھر اچانک ان پر علالت کا آخری شدید حملہ ہوا اور اطہر بھائی ہم لوگوں کے درمیان سے اٹھ گئے۔

دروازہ کھلا ہے کہ کوئی لوٹ نہ جائے　　　　اور اس کے لیے جو کبھی آیا نہ گیا ہو

اطہر بھائی کی زندگی کے آخری برسوں میں، میں نے انھیں بڑے قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔ میں کہہ سکتا ہوں اور برملا کہتا ہوں کہ اطہر بھائی کا خمیر شرافت، نیکی اور خیر سے اٹھا تھا۔ وہ اس پُر آشوب دور میں ایک وضع دار تعلیق اور مہذب انسان تھے۔ شائستگی اور حلاوت ان کی پہچان، خلوص، دردمندی اور غم گساری ان کی فطرت تھی۔ وہ اول و آخر شاعر تھے۔ صرف شاعر، اس کے سوا کوئی اور نہیں ـــ اطہر بھائی کی عظمت اور بڑائی کا راز کیا ہے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں اور اصرار کرتا ہوں کہ مجھ سے اتفاق کیجیے ــــ

اطہر بھائی اپنے والہانہ عشق میں ناکام رہے۔ وہ اپنے محبوب کو حاصل نہ کر سکے اور وہ "دمہ" کے مرض میں مبتلا تھے۔ باتیں کرتے کرتے ان کا سانس اکھڑ جاتا تھا۔ ان پر طویل کھانسی کے دورے پڑتے تھے۔ وہ اپنے گلاس میں کسی کو پانی نہیں پینے دیتے تھے۔ ان کی زندگی کا کوئی بھروسا نہ تھا ـــ کوئی اعتبار نہ تھا ـــ لیکن انھوں نے کیا کہا ـــ یہی کہا کہ:

اور کچھ یوں ہے کہ اب بھی حوصلہ جینے کا ہے　　　　میں نے روشن کر لیا سینے میں دل بجھتا ہوا

"بجھتے ہوئے دل کو روشن رکھنا" یہی اطہر بھائی کا پیغام ہے جو وہ ہمیں دیتے رہے۔ ان کی آواز ـــ میٹھی اور پُر حلاوت آواز اب بھی کانوں میں گونجتی ہے:

سانس لینا بھی اک فریضہ ہے — کارِ ہستی میں جی لگا لو کچھ
راکھ ہوتے ہیں کیا ملے گا تمہیں — ہاں اِسی آگ سے بنا لو کچھ
ایسی ہنگامہ خیز دنیا میں — رنجِ تنہائی بھی اُٹھا لو کچھ

مائی ڈیئر عبیداللہ علیم! ۱۹۶۴ء میں تم نے ٹھیک ہی تو کہا تھا:

"اختر! ان سے ملو یہ اطہر بھی ہیں اور نفیس بھی۔"

تو کیا واقعی وہ اطہر اور نفیس انسان ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا ہے؟

یادوں کا سفر جاری ہے ——

غزل نما

قدیم شعرا کا تعارف و انتخاب کلام

آدا جعفری

"قومی زبان" میں شائع ہونے والے انتخابات

کتابی شکل میں

شائع ہو گئے ہیں

قیمت : ۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی ۱

انجمن کی اجازت سے "غزل نما" ہندوستان میں مکتبہ جامعہ نئی دلّی نے بھی شائع کیا ہے۔

اوپندر ناتھ اشک

اردو کے معروف مصنف اوپندر ناتھ اشک کے اعزاز میں منعقدہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے استقبالیہ میں (دائیں سے بائیں) مختار زمن، نورالحسن جعفری (صدرِ انجمن) مہمان خصوصی اور ڈاکٹر اسلم فرخی

مختار زمن

اوپندر ناتھ اشک — ایک تاثر

الہ آباد شہر کی گنجان آبادی سے گھرا ہوا ایک باغ ہے جسے خسرو باغ کہتے ہیں۔ یہاں مغل شاہ زادے خسرو کو نظر بند کیا گیا تھا۔ اس باغ کے امرود بہت مشہور ہیں گلعذاروں کی طرح حسین و خوش رنگ، گول گول، سرخ چتیوں والے امرود جن کے متعلق اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

اب الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے　　یاں دھرا ہے کیا بجز اکبر کے اور امرود کے

خسرو کی زندگی جتنی تلخ تھی اسی قدر خسرو باغ کے امرود شیریں ہوتے ہیں۔ باغ کی اونچی چہار دیواری سے لگی ہوئی سڑک خسرو باغ روڈ کہلاتی ہے۔ اسی سڑک پر مکان نمبر ۵ واقع ہے۔ الہ آباد کے اکثر پرانے بنگلوں اور کوٹھیوں کی طرح اس کی چھت کھپریل کی ہے۔ اسی مکان میں اُپندر ناتھ اشک صاحب رہتے ہیں۔

مارچ ۱۹۸۸ء میں مجھے الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا تو اشک صاحب سے ملنے کا بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ الہ آباد میں گنگا جمنا کے سنگم پر دور دور سے یاتری اشنان کرنے آتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس شہر میں تریبنی پر آکر ایک طرف گنگا، جمنا کا سنگم ہے تو دوسری طرف نمبر ۴ خسرو باغ روڈ پر اردو ہندی کا سنگم بھی موجود ہے، کیوں نہ ادب کی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیے جائیں — چنانچہ ایک دن صبح کو تقریباً دس بجے اشک صاحب کے مکان پر حاضر ہوا۔ اطلاع کرائی، ملازم نے مکان سے ملحق لائبریری میں مجھے بٹھا دیا۔ وہاں اردو ہندی اور انگریزی کی سیکڑوں کتابیں الماریوں میں قرینے سے رکھی تھیں۔ درجنوں رسالے میز پر چنے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اشک صاحب اندر سے تشریف لائے۔ میانہ قد، دبلے پتلے بند گلے کا کوٹ، گرم ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ جب میں انٹر یا بی اے میں پڑھتا تھا تو ان کی تصویر کسی رسالے میں دیکھ چکا تھا۔ اس وقت وہ چشمے کے پیچھے سے جھانکتی روشن آنکھوں والے جوان تھے — اور اب وہ ایک تجربہ کار اور باوقار انسان معلوم ہوئے۔ آج آپ ان کے چہرے پر جو ڈاڑھی دیکھ رہے ہیں، یہ مارچ ۱۹۸۸ء میں نہیں تھی۔ ڈاڑھی کے معاملے میں دو گروہ بڑا مثبت رویہ رکھتے ہیں اور اس کی غور و پرداخت سے غافل نہیں ہوتے، ایک مولوی اور دوسرے سکھ۔ سکھوں اور مولویوں کی ڈاڑھیاں ان کی عمر سے کوئی ۱۶ — ۱۷ برس چھوٹی ہوتی ہیں۔ جب اس عمر میں وہ برآمد ہوتی ہیں تو عمر بھر کا پٹا لکھا کر آتی ہیں۔ گو ع عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے — اشک صاحب کی ڈاڑھی ان سے

تقریباً ۸ ، ۷ برس چھوٹی ہے۔ مگر خدا اشک صاحب کو عمرِ نوح عطا کرے۔ ان کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ع
ریش کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے ۔۔ مطلب یہ کہ **ان کی ڈاڑھی عارضی ہے**۔ خود فرماتے ہیں کہ "ناول لکھ رہا ہوں جس دن ناول ختم ہو جائے گا اسی دن گالوں پر استرا پھر جائے گا۔" مگر کیا پتا دوسرا ناول شروع کر دیں؟ مگر ڈاڑھی لیڈر اور دانشور کا شاندار مرکب ضرور ہے۔

الہ آباد میں اگرچہ میری اور ان کی پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی لیکن وہ اس اپنائیت سے ملے جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتے ہیں۔ بے تکلفی سے گفتگو شروع کر دی۔ کہنے لگے "یہ میرے ناشتے کا وقت ہے۔ تم بھی میرے ساتھ ناشتہ کر لو۔" میں گھر سے ناشتہ کر کے چلا تھا لیکن دراصل میں ناشتے اور کھانے کو کارِ خیر سمجھتا ہوں اور ع در کارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست عرض کیا۔ "آپ فرماتے ہیں تو آپ کے ساتھ ایک پیالی چائے پی لوں گا۔" چنانچہ اندر سے ایک نوکر طشتری میں چائے، بسکٹ اور خوب کھلی ہوئی پھر بری سی کھچڑی لایا۔ ٹھیک یاد نہیں، شاید اشک صاحب نے دلیہ یا پورج کھایا۔ پھر باتیں شروع ہوئیں۔ دنیا جہان کی باتیں۔ اردو ہندی فکشن، اپنی کتابوں، خصوصاً گرتی دیواروں کے لکھنے کا قصہ، اپنے پچھلے دورۂ پاکستان کا ذکر، پاکستان میں تیار ہونے والے کرتوں، سواتی ٹوپیوں اور ناگرہ جوتوں کا مسئلہ۔ اشک صاحب گفتگو خوب جم کر اور بڑی بے تکلفی سے کرتے ہیں۔ وہ بے حد صاف گو آدمی ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ ان کا ذہن حالات و واقعات کا بھرپور ریکارڈ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور یہ خوشی اس وقت دوبالا ہو گئی جب انھوں نے پنی چار تازہ ترین کتابیں مجھے عنایت کیں۔ خوشی، احسان مندی اور تشکر میں بدل گئی۔ کتابوں پر انھوں نے تحریر کیا۔ "محبی مختار زمن کے لیے، محبت، خلوص اور نیک خواہشات کے ساتھ۔" اور نیچے سمندر میں اٹھتی ہوئی حسین لہروں کی طرح پیچ و خم کھاتا ہوا اپنا نام اپندر ناتھ اشک لکھا۔ دستخط کی تحریریں بھی زندگی کے مد و جزر نظر آتے ہیں۔

میں نے اشک صاحب کے کچھ افسانے پڑھے تھے۔ ان کی سوانح سے بھی تھوڑا بہت واقف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ۱۹۱۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ وہ درس و تدریس سے متعلق رہے۔ اخبار نویسی کی، ریڈیو اور فلم میں ڈراما نگاری اور مکالمہ نویسی کی، مشکل حالات سے گزرے۔ مگر انھوں نے تمام مشکلات کو، حتیٰ کہ دق کی بیماری کو پچھاڑ دیا لیکن یہ مجھے اسی دن معلوم ہوا کہ موصوف نے پانچویں جماعت ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا، گویا ع تھا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا انھوں نے پہلے پنجابی میں بیت لکھے اور "شاد" تخلص رکھا، پھر اردو اور بعد میں ہندی میں لکھنا شروع کر دیا۔ ان کا قلم اور ان کی طبیعت کو قرار نہیں اور حال یہ ہے کہ ع رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔

اشک صاحب کی افسانہ نگاری یا ناول نویسی پر تنقید و تبصرہ کرنا میرا منصب نہیں۔ یہ کام نقادوں کا ہے، لیکن قاری کی حیثیت سے چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ اپندر ناتھ اشک ان چند لکھنے والوں میں ہیں جو باقاعدہ، مسلسل، محنتِ شاقہ کے ساتھ لکھتے رہتے ہیں۔ وہ جز وقتی ادیب نہیں ہیں کہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ دوسرے کاموں میں صرف کرتے رہیں۔ کبھی موڈ ہوا یا کسی رسالے کا تقاضا ہوا تو کچھ لکھ دیا۔

یقینی طور پر تو مجھے معلوم نہیں مگر قیاس کہتا ہے کہ اشک صاحب کے لیے اسی طرح نشے کی سی عادت

بن گیا ہے جس طرح مثلاً چہکنا چڑیوں کی، کوکنا کوئل کی، نشہ کرنا شرابی کی، سگار پینا چرچل کی فطرتِ ثانیہ سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بغیر لکھے رہ نہیں سکتے انھیں قلم و کاغذ کے بغیر چین نہیں آتا اور قلم و کاغذ ان کے بغیر اکیلے اکیلے محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے ادیب اور بہت سے فن پاروں کے خالق ہیں۔ میں نے ان کی تمام تخلیقات نہیں پڑھیں لیکن جتنا پڑھا ان میں "گرتی دیواریں" خاصے کی چیز معلوم ہوا۔ یہ شاہ کار ہے۔ ان کی تخلیقات کو پڑھ کر یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ محض جھوٹ موٹ کی افسانہ طرازی ہے، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اصلی، جیتے جاگتے، چلتے، پھرتے انسانوں کے سچے واقعات سنا رہے ہیں۔ ان کے کردار نقلی، مکالمے جعلی اور واقعات ان ہونے اور بے سر و پا معلوم نہیں ہوتے۔ میری ناچیز رائے میں بہترین ایکٹر وہ ہے جسے پردۂ سیمیں پر دیکھ کر یہ نہ معلوم ہو کہ وہ ایکٹنگ کر رہا ہے بلکہ یہ محسوس ہو کہ یہ سب کچھ اس پر بیت رہا ہے اور وہ ایکٹر نہیں بلکہ واقعہ کا اصل آدمی ہے۔ اسی طرح اس دَور میں مجھے بہترین ناول یا افسانہ وہ لگتا ہے جسے پڑھ کر محسوس ہو کہ یہ واقعہ ہے اور اس کردار سے تو کہیں مل چکے ہیں۔ "اس دَور"، کے الفاظ میں نے دانستہ استعمال کیے ہیں۔ اس لیے کہ قدیم دور طلسمِ ہوش رُبا اور داستانوں کا دور تھا۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ لیکن یہ دور ناول اور افسانے کا دور ہے۔ اب زمین کی اور زمین پر رہنے بسنے، چلنے پھرتے، لڑنے مرنے والوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ پرانے زمانے میں اسٹیج پر ایکٹر اس طرح بولنے پر مجبور تھا جیسے کوئی سیاسی ایجی ٹیٹر چلا رہا ہے یا ڈانٹ رہا ہے۔ "توفیق تو کس حال میں ہے۔ شیر لو ہے کے جال میں ہے۔" صاف پتا چلتا تھا کہ یہ "ایکٹنگ" کر رہا ہے ــــ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب نقل مطابق اصل والا معاملہ ہے ــــــــ گرتی دیواریں پڑھیے تو معلوم ہو گا کہ سب کردار اصلی، سب مکالمے سچے ہیں جو بیان کیا جا رہا ہے وہ واقعہ ہے، فرضی حکایت نہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ جو اشک صاحب کی عینک پوش آنکھ ہے اس میں بڑی دُور بینی اور خورد بینی صفات ہیں۔ یہ آنکھ اِدھر اُدھر کی ہر چیز کو غور سے دیکھتی ہے، کان ہر آواز کو سنتے ہیں اور یہ جو ٹوپی سے چھپا ہوا سر ہے اس میں ہر واقعے کا ریکارڈ جمع ہوتا رہتا ہے۔ وہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو کمپیوٹر کی طرح پچھلے واقعات، مکالمات اور کردار سامنے آ جاتے ہیں۔ بلکہ میں نے جب "گرتی دیواریں" پڑھا تو محسوس ہوا کہ اس میں تو اشک صاحب کی آپ بیتی کی سی صداقت ہے۔ ان کی سوانح نہ ہو نیم سوانحی ضرور ہے۔

اُوپر عرض کر چکا ہوں کہ اشک صاحب صاف گو آدمی ہیں۔ بڑے صاف گو۔ وہ ٹکّا توڑ جواب دیتے ہیں۔ ان کے فن پارے چیخ چیخ کر بتاتے ہیں کہ ہمارا خالق ایک لبرل خیالات کا آدمی ہے جو ریاکاری کے پرزے اڑانے کے لیے ہر وقت تلوار تانے رہتا ہے اور ظاہر داری کے پردے پھاڑنے کے لیے طنز کے تیر تیار رکھتا ہے ــــ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "کٹی قوم پرست لیڈر ستیہ اور اہنسا پر عمل کے سلسلے میں خواہ مہاتما گاندھی سے کتنے ہی پیچھے ہوں مگر جہاں تک ظاہر داری کا تعلق ہے وہ ان سے کہیں آگے تھے۔ ایک صاحب صرف سنگھاڑے اور دہی کھاتے تھے، دوسرے پھل، تیسرے ساگ اور سبزی پر گزر کرتے، چوتھے صبح اُٹھتے ہی رام نام لینے کے بعد محض تزکیۂ نفس کے لیے اپنے منھ پر سات تھپڑ مارتے تھے اور ہمیشہ شبنش آسن کرتے۔ وہ مسافروں سے بھری گاڑی میں

بھی سفر کے دوران بلا تکلف سر کے بل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (بڑی بڑی آنکھیں)

اشکؔ صاحب نے "گرتی دیواریں" میں دیکھے بھالے کرداروں کی دنیا بسا رکھی ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھیں وہ جانتے پہچانتے ہیں۔ مکینوں کے علاوہ وہ شہر اور قصبات کے مکانوں، سڑکوں، گلیوں، تانگوں کے اڈوں، خوانچہ والوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے ان کے قلم سے بنی ہوئی تصویریں صحیح اور سچی ہیں جیسی مثلاً ڈکنس کے یہاں نظر آتی ہیں۔ عورتوں پر ہونے والے ظلم کی وہ بڑی دردناک تصویر کھینچتے ہیں۔ بیٹی ہو یا بیوی، بیوہ ہو یا بیاہی، وہ ہر جگہ ظلم کی چکی میں پیسی جاتی ہے۔ بہروپیوں، نوسربازوں، دھرم اور مذہب کا لبادہ اوڑھنے والے ریاکاروں کا وہ خوب پول کھولتے، کوڑے کرکٹ، دھوئیں اور گندگی سے بدبودار اور مکدر فضا پر سے پردہ اٹھانے سے وہ ہچکچاتے نہیں۔ بڑی بانکی گلکاری کرتے ہیں۔ لاہور کے چنگڑ محلے کی گلیوں، مکانوں، مکینوں اور استعمال کرنے والوں کا حال پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ آپ خود ناک پر رومال رکھے وہاں سے گزر رہے ہیں۔

پچھلے سال حکومت نے انھیں ایک بہت بڑا انعام دیا۔ الہ آباد میں جب میں ان سے ملا تو میں نے پوچھا کہ "کیا آپ یہ انعام حاصل کرنے دہلی یا شاید بمبئی جائیں گے۔" کہنے لگے "نہیں جی، میں بوڑھا بیمار آدمی، میں کہاں اتنا لمبا سفر کروں گا۔"

دراصل اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آرہا تھا کہ اشکؔ صاحب ایک دفعہ پھر پاکستان کا دورہ کرلیں تو کتنا اچھا ہو۔ مگر ان کا جواب اور سفر کے بارے میں ان کے خیالات سن کر میں خاموش ہوگیا۔ اور سوچنے لگا کہ اشکؔ آور گیس نو ایجاد ہو چکی ہے مگر بڑی بے ہودہ اور ناگوار چیز ہے خدا کرے کوئی ایسی گوارا صورت بھی معرض وجود میں آجائے جو "اپیندر ناتھ اشک آور" ہو — قبولیت کی گھڑی تھی، میری تمنا پوری ہوگئی۔ پچھلے ہفتے ان کا خط آیا کہ "میں آرہا ہوں "اب گرتی دیواریں" کا صرف آخری حصہ رہ گیا ہے۔ اس کا پس منظر لاہور کا ہے اس لیے لاہور کی یادیں تازہ کرنے کو میں نے پاکستان کے سفر کا پروگرام بنایا ہے۔" لیجیے صاحب گرتی دیواریں ہمارے لیے ان کے خیر مقدم کی اٹھتی خوشبو میں تبدیل ہوگئیں۔

ایک بات اور عرض کردوں۔ اشکؔ صاحب دیکھنے میں دُبلے پتلے سینک سلائی آدمی ہیں۔ خط میں لکھا کہ "بے حد ضعیف ہوں، دمے کا مریض ہوں، ارتھرائٹس بھی ہے۔" مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ان باتوں سے دھوکا نہ کھائیے گا۔ موصوف نہایت جفاکش، نہایت محنتی، مضبوط قوتِ ارادی کے مالک، نہایت زندہ دل انسان ہیں بیماری کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اسے ایسے ہی چھیڑتے ہیں۔ جیسے مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی چھیڑ خوباں سے چلتی رہتی تھی۔ ایسے نہ ہوتے تو لاکھوں الفاظ ان کے جاندار قلم سے کیسے نکلتے۔ جس منحنی شخص کو آپ یہاں دیکھ رہے ہیں، دراصل وہ ایک نواسی (۸۹) سالہ جوانِ رعنا ہے جو بڑے لمبے سفر کے بعد یہاں آنکلا ہے اور جس کے پیچھے ادب نوازوں کی فوج ہے ؎

سوختِ جگر ساتھ ہیں سو پارۂ دل ہیں
اشکؔ آن کے اِس شان سے اِس دھوم سے نکلا

انور عنایت اللہ

اوپندر ناتھ اشک

دو دن ہوئے جب میں نے ڈان میں اوپندر ناتھ اشک صاحب کی تصویر دیکھی تو خدا کا شکر ادا کیا۔ اگر یہ تصویر نہ دیکھتا اور یہ کسی ادبی یا غیر ادبی محفل میں مل جاتے تو میں ان سے یہ سمجھ کر دور بھاگتا کہ یہ کوئی بڑے کٹر قسم کے مولوی صاحب ہیں، وہ بھی دیوبندی یا بریلوی۔ ان دونوں طرح کے مولویوں سے میرا دم نکلتا ہے۔

کل شام کو ان سے ملاقات ہوئی تو ان سے گلے مل کر بہت سی باتیں یاد آگئیں۔ ان کی بے انتہا صاف گوئی، ان کی انا جس کی وجہ سے انھوں نے بہت سوں کو خفا کیا۔ ان کی برجستہ گفتگو کا انداز، ان کی بذلہ سنجی جس کی وجہ سے اداس محفلیں بھی زعفران زار بن جاتی ہیں۔ ان کے قلم سے زیادہ ان کی زبان کی طنزیہ کاٹ، جس سے ان کے اکثر دشمن پناہ مانگتے ہیں۔ کل رات جوان کی باتیں سنیں تو لگا یہ اپنے اسّی سالہ سفر کے باوجود بالکل نہیں بدلے۔ اب بھی وہ اتنے ہی چست اور چوکس ہیں جتنے کہ عالمِ شباب میں تھے۔ اشک صاحب کے دوسرے بہت سے مشاغل اور ان کی صلاحیتوں سے بھی میں واقف ہوں۔ مثلاً اپنے دشمنوں کی نقل اُتارنا یا کسی کی موت پر جس طرح محلّے کی عورتیں جمع ہو کر سیاپا کرتی ہیں اس کی بہترین نقّالی وغیرہ، وغیرہ۔

غالباً ایسی ہی صلاحیتوں کی وجہ سے یہ پنڈت طوطا رام جیسے کردار کو جنم دے سکے۔ دراصل پہلی بار میں نے انھیں پنڈت طوطا رام ہی کے روپ میں دیکھا۔ بمبئی میں ایک فلم کا سیٹ تھا۔ اس میں منٹو کے علاوہ اشک صاحب بھی اداکاری کے جوہر دکھا رہے تھے۔ جب مجھے بتایا گیا کہ وہ دُبلا پتلا صرف دھوتی میں ملبوس پنڈت نما شخص اوپندر ناتھ اشک ہے تو مجھے یقین نہیں آیا۔ ماتھے پر تِلک، آنکھوں پر کیا ناک پر عینک، دل چسپ مکالمے ادا کرنے کا انداز بھی منفرد۔ اگر یہ فلمی دنیا میں ٹِک جاتے تو ادب کو بہت نقصان پہنچتا۔ یہ بہت جلد لوٹ آئے۔ پھر میں نے دوستوں اور بزرگوں سے ان کے بارے میں بہت کچھ سُنا۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ان کی وابستگی، ہم عصر ادیبوں سے ان کی چھیڑ چھاڑ، ان کی شادی کی داستان، ان تفصیلات کے ساتھ ان کے افسانے اور ڈرامے پڑھے تو اشک صاحب کی شخصیت اور زیادہ دلچسپ لگی۔

آج سے تقریباً پینتالیس سال پہلے میں نے لکھنا شروع کیا تو اس وقت بھی اوپندر ناتھ اشک کا شمار اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ اس وقت انھوں نے ڈرامے کم لکھے تھے افسانے زیادہ۔ ان کے علاوہ

کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی کے افسانوں کے بغیر کسی بھی ادبی رسالے کو معیاری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اشک صاحب کا رنگ ان سب سے مختلف تھا۔ نہ وہ کرشن چندر کی دلکش زبان رکھتے تھے اور نہ راجندر سنگھ بیدی کی، جسے کئی نقاد کھردری کہا کرتے تھے۔ ان کے یہاں نہ منٹو اور عصمت کی بیباکی تھی اور نہ خواجہ احمد عباس کا سیاسی رنگ۔ اس کے باوجود ان کی کہانیاں قاری کو صرف اس لیے متاثر کرتی تھیں کہ ان میں خود اس کے جذبات اور احساسات کی بھرپور عکاسی ہوتی تھی۔ ان میں وہ تمام آنسو اور دھڑکنیں ہوتی تھیں جو نوعمر قاری کو گرویدہ کر لیتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں زندگی کے تلخ حقائق کی بھی ایسی عمدہ عکاسی تھی جو سلجھے ہوئے قاری کو غور و فکر کا مواد مہیا کرتی تھی۔ ان کے ابتدائی دور کے کسی افسانے کو بھی لیجیے ــ بیگن کا پودا، کڑاں کا پتلی، یا ان کے افسانوں کے مجموعے کونپل، ڈاچی یا چٹان کے کسی افسانے پر بھی غور کیجیے اس کے کردار جیتے جاگتے لگتے ہیں جنھیں قسمت، حالات، مروجہ روایتوں نے اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ مل کر اپنی بے بسی کا رونا بھی رو نہیں سکتے۔ اس کے باوجود ان میں زندہ رہنے کی تمنا، حالات کو بدلنے کا جذبہ باقی نظر آتا ہے۔

ان کی فنی زندگی کے ابتدائی دور کے دو ناولوں کا بطورِ خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں ــ ایک "شکست" جسے کرشن چندر نے لکھا تھا اور دوسرا "ستاروں کے کھیل" جس کے مصنف اوپندر ناتھ اشک ہیں۔ دونوں ناولوں کے موضوع محبت، انسانی رشتے اور زمانے کے ہاتھوں انسان کی بے بسی ہیں۔ چونکہ دونوں کے کینوس مختلف ہیں اس لیے کردار نگاری کے بھی علیحدہ علیحدہ رنگ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اندازِ بیاں اور زبان کے استعمال کے فرق کی وجہ سے "شکست" اگر آپ کو حسین تصورات کی دنیا میں اڑا کر آسمانوں کی طرف لے جاتا ہے، تو "ستاروں کے کھیل" زندگی کے تلخ حقائق کی یاد دلا کر آپ کو زمین ہی پر رکھتا ہے۔ یہاں میری مراد ان دونوں ناولوں کا موازنہ نہیں کیونکہ میری رائے میں دونوں ہی قابلِ قدر ہیں۔ میرا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اشک صاحب نے اپنے اظہار کے لیے جو راہ آج سے چالیس پچاس سال پہلے ڈھونڈ نکالی تھی اس پر وہ قائم رہے اور کسی ملکی یا غیر ملکی مفکر سے اثر قبول نہیں کیا۔ اگر کیا بھی تو اس کی جھلک ان کی کہانیوں یا ڈراموں میں صاف نظر نہیں آتی۔

اوپندر ناتھ اشک صاحب کی بہت سی تصانیف ہیں۔ یہ اردو میں بھی ہیں اور ہندی میں بھی۔ پچھلے پندرہ بیس سال میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا بیشتر حصہ ہم تک نہیں پہنچا۔ اسی لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شاعر ہیں اور کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے پاکستان آتے ہیں۔ اس میں نہ ان کا قصور ہے اور نہ ایسی باتیں سوچنے والوں کا۔ مشکل یہ ہے کہ سرحد کی دونوں طرف آنا جانا شعرا حضرات ہی کا رہتا ہے، ہم نثر نگاروں کو کون پوچھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اوپندر ناتھ جی، اشک تخلص فرماتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ انھوں نے اردو، ہندی، پنجابی میں اچھی شاعری کی ہے لیکن میرا خیال ہے بنیادی طور پر افسانہ اور ڈراما ہی ان کا اصل میدان ہے۔ فی الحال میں انھیں اس میدان کا شہسوار اس لیے نہیں کہوں گا کیونکہ اب گھڑ سواری کی ان کی عمر نہیں رہی۔

ویسے شاعری غالباً وہ منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کرتے ہیں۔ جو اپنی نثر میں الفاظ ایک شاعر کی طرح خاصے

غور و فکر کے بعد استعمال کرتا ہو، اسے اظہار کے لیے شاعری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے اس بیان کا ثبوت ان کے افسانے ہیں۔ یہ بھی ان کے ڈراموں کی طرح اپنا ایک منفرد رنگ رکھتے ہیں۔ ڈرامے کے فن پہ انھیں کس قدر عبور ہے اس کا ثبوت ان کے مجموعے قفس، گرداب، جنت کی جھلک اور انجو باجی ہیں۔

اپنے افسانوی سفر کی روئیداد انھوں نے بڑے دل چسپ انداز میں اپنی ایک کتاب "میری افسانہ نویسی کے چالیس برس" میں سنائی ہے۔ یہ جتنی معلوماتی ہے اتنی ہی دل چسپ بھی، کیونکہ اپنی صاف گوئی کا سہارا لے کر اپنے مخصوص انداز میں انھوں نے ادب کے میدان کے بہت سے معرکے، اپنی محبتیں اور نفرتیں، سب کی کہانی سنائی ہے جو ہمارے ایک اہم ادبی دور کی تاریخ ہے۔

ان کی کئی اور تصانیف کو میں قابلِ قدر سمجھتا ہوں۔ مثلاً ان کا ایک ناول ہے — "بڑی بڑی آنکھیں"، جو کراچی میں آج کل فروخت ہو رہا ہے۔ یا پھر کشمیر کے پس منظر پہ لکھی ہوئی تصنیف "پتھر الپتھر" جس کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے — "منٹو میرا دشمن" بھی ان کی ایک خاصی مشہور کتاب ہے۔ سنا ہے ان کا تازہ ترین ناول "گرتی دیواریں" بھی اچھا ہے۔ اس کی اب تک غالباً صرف ایک ہی جلد شائع ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے اب تک یہ ناول میری نظروں سے نہیں گزرا۔

مشکل یہ ہے کہ نہ ہماری کتابیں جائز طریقے سے سرحد پار کر کے ہندوستان جا سکتی ہیں اور نہ وہاں سے اچھی اچھی کتابیں پاکستان آ سکتی ہیں۔ کتابوں اور رسالوں کا تبادلہ آسان ہو جائے تو شاید البطے کے بہت سے راستے نکل آئیں اور اس کے ساتھ ہی ہم افسانہ نگاروں کو بھی سفر کے مواقع ملیں۔ اوپندر ناتھ اشک صاحب ایک ایسے دور میں پاکستان تشریف لائے ہیں جب دونوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت کی فضا بہتر ہو رہی ہے اور بہت ممکن ہے کتابوں کے تبادلے کی بھی کوئی صورت نکل آئے۔ اگر کبھی یہ ہوا تو کوئی پڑھا لکھا نوجوان پاکستانی یہ نہیں پوچھے گا کہ اوپندر ناتھ اشک صاحب کون سے مشاعرے میں شرکت کے لیے پاکستان آئے ہیں اور ایک درجن اردو اور انگریزی کتابیں لکھنے کے بعد بھی مجھ سے دہلی کی اردو اکیڈمی میں کوئی ہندوستانی نوجوان یہ نہیں پوچھے گا۔ کہ میں کیا بیچتا ہوں۔

مضمون صاف خوش خط اور صفحہ کے ایک طرف لکھیں

غزل نما

تعارف و انتخابِ کلام

ادا جعفری

شیخ مہدی علی ذکی

نام، شیخ مہدی علی۔ تخلص ذکی۔ والد کا نام شیخ کرامت علی تھا۔ پیدائش ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۳ء وفات ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء۔

مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے اور علمائے فرنگی محل سے استفادہ کیا۔ یہ نواب سعادت علی خاں کا آخری زمانہ تھا۔ لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہو کر دہلی چلے گئے۔ دہلی میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مکان پر محفلِ مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔ ان مشاعروں کے وسیلے سے ذکی کی ملاقات دہلی کے اکابر شعرا سے ہوئی پھر دہلی سے سہارن پور گئے اور وہاں تحصیل دار کے فرائض انجام دیے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ ملازمت ترک کر کے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ نظام دکن آصف جاہ پنجم کے قصائد لکھے اور انعام و اکرام پایا۔

حیدر آباد دکن میں بھی دل نہیں لگا اور واپس مراد آباد اور پھر لکھنؤ پہنچے اور واجد علی شاہ کے دربار میں فیض حاصل کیا۔ نواب نے ذکی کو ملک الشعرا کا خطاب بھی دیا۔ بعد میں کچھ عرصہ نواب یوسف علی خاں، والیِ رام پور کے دربار سے بھی منسلک رہے۔

فارسی شاعری میں مرزا قتیل سے اصلاح لی اور اردو شاعری میں مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ ابتدا میں تخلص مہدی تھا۔ مصحفی کے مشورے سے ذکی تخلص اختیار کیا۔

شاعری میں مصحفی کا رنگ ملتا ہے۔

یہ انتخاب کلامِ ذکی، مطبوعہ مطبع نول کشور سے کیا گیا۔

انتخاب کلام

اک پری وش پہ دل ان روزوں جو ہے آیا ہوا
ہر طرف پھرتا ہوں دیوانہ سا گھبرا یا ہوا

جلوہ کرتا ہے دوبالا دلبرِ چالاک کا
چمپئی رنگت پہ عالم چمپئی پوشاک کا

رمزِ سوال ہے نہ اشارہ جواب کا — خانہ خراب عالمِ شرم و حجاب کا
ساقی رہا نہ بزمِ خرابات کے حریف — افسانہ رہ گیا مرے حالِ خراب کا

کیا کیجیے خیال خزاں و بہار کا — کیا اعتبار ہستیِ بے اعتبار کا

نہیں خیال کچھ اس گُل کی بے وفائی کا — بہار پر ہے مزہ تازہ آشنائی کا

یہ کیا سبب کہ تکلّف ہے مہربانی کا — تپاک سے ترے دھڑکا ہے بدگمانی کا
گیا شباب کہ اڑتی ہے خاک سی منھ پر — غبار چھوڑ گیا قافلہ جوانی کا
اثر ہے چمپئی رنگت کا اس پری وش کی — کہ رنگ دھانی ہے پوشاک آسمانی کا

اب تک ہوا نہ داغِ جگر کا جو گل چراغ — اے آفتابِ صبح ترا انتظار تھا
اب یار لوگ عیب سمجھتے ہیں اے ذکی — وہ دن گئے کہ علم و ہنر کا وقار تھا

لاتا نہ تھا رقیب کے آگے زبان پہ — شکوہ جو دل میں اس بُتِ نامہرباں سے تھا

آیا وہ چاندنی میں تو رنگت ہوئی سفید — نکلا جو دھوپ میں تو سنہرا بدن ہوا
اے گُل ترے شہیدِ تبسّم کے واسطے — پیرایۂ بہار گلابی کفن ہوا

اچھا ہوا کہ عشق کی رسوائیاں ہوئیں — کچھ ہم سے آشنا تو وہ نا آشنا ہوا

خون کر چکا جگر کو تُو خالی دکھا کے جام — ساقی بس اب نہ چھیڑ کہ دل ہے بھرا ہوا

کوئی رہا نہیں مہماں سرائے ہستی میں — ادھر سے قافلہ آیا ادھر روانہ ہوا

شمع گل ہونے لگی یارانِ محفل اٹھ چلے — ایک میں رونے کو تنہا انجمن میں رہ گیا

جان دینے عوضِ نیم نگہ ہم اے جاں   تم نے چھوٹے کبھی دل بھی نہ ہمارا دیکھا

ترا بھی عالمِ نازو ادا سدا نہ رہا   نہ پوچھ حال مرا میں رہا رہا نہ رہا

عشرت کدے تو دورِ فلک نے کیے خراب   ویرانۂ جنوں مگر آباد رہ گیا

خوف و رجا میں زیست گزرتی رہی کہ یار   نا مہرباں کبھی تو کبھی مہرباں رہا
عالم میں فیضِ لطفِ طبیعت سے اے ذکی   جوں بوئے گل عزیز رہا میں جہاں رہا

جب خیالِ اثرِ طرۂ پیچاں باندھا   ہم نے اشعار میں مضمونِ پریشاں باندھا

کیوں ہم صفیر اب تو بہاریں ہیں بے خلش   کانٹا تھا ایک میں کہ چمن سے نکل گیا

جب کہ سجدے میں جھکا یا سرِ عجز   تو ہی بس نام خدا یاد آیا
بات کہنے کی تمنا تھی ذکی   منھ کھلا اب تو گلہ یاد آیا

واقعی قابلِ سزا ہیں ہم   یعنی دیرینہ آشنا ہیں ہم

بندِ قبا سے نیل ہے اس کے بدن میں آج   نسوں کا گل کھلا چمنِ یاسمیں میں آج
چنگاریاں سی اُڑتی ہیں اپنے سخن میں آج   گویا ستارہ ریز زباں ہے دہن میں آج

خزاں سے غیر نہ بیگانۂ بہار ہوں میں   چمن سے دور نہ کر سبزۂ مزار ہوں میں
یہ تو بہ کرتے سے شرمندگی ہوئی توبہ   کہ ہر بہار میں ساقی سے شرمسار ہوں میں
جہاں میں قافلۂ رفتہ کا غبار ہوں میں   ذکی گزشتہ زمانے کی یادگار ہوں میں

اور کچھ کیا کہوں پر اے قاصد   یہی کہہ دیجیو کہ مرتا ہوں
دیکھتا ہوں جمالِ یار ذکی   جس طرف میں نگاہ کرتا ہوں

تنگ کیوں جان سے ہم سینہ فگار آتے ہیں
زندگی ہے تو پھر ایامِ بہار آتے ہیں

منزلِ دہر میں ہم ملکِ عدم سے چل کر
ہیں کچھ ایامِ مصیبت سوگوار آتے ہیں

ہم صدا اس کو سناتے ہیں کہ دل کو اپنے
زیرِ دیوار کھڑے ہو کے پکار آتے ہیں

اِس پتے پر پوچھنا قاصد مکانِ یار کو
چاندنی کہتے ہیں کس کے سایۂ دیوار کو

قول و قرار کرتا ہے وہ بے وفا مگر
اس شرط پہ کہ عہدِ وفا درمیاں نہ ہو

مدِّ نظر ہزار تمنّا اور ایک دل
یارب فریفتہ یہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

آئی صبیحِ رنگ پہ سُرخی شباب کی
مہتاب پر شبیہہ کھنچی آفتاب کی

دلِ بسمل ترے کوچے میں تڑپتا ہووے
تو بھی ہو گرمِ تماشا تو تماشا ہووے

منھ وہ دکھلائے تو ہو گرمیِ بازارِ بہار
زلف کھولے تو خریدار کو سودا ہووے

کوئی دَم جلوۂ دیدار غنیمت ہے ذکیؔ
دیکھ لے بھر کے نظر دیکھیے پھر کیا ہووے

آخر کبھی تو وعدہ وفا دلربا کرے
محشر تلک تو زندگی اپنی وفا کرے

دنیا سے رسم و راہِ وفا اُٹھ گئی ذکیؔ
نافہم ہے جو کوئی کسی کا گلہ کرے

بزمِ دہر کا عالم ابتدا سے ہے یکساں
دور ہو چکے آخر اور وہی خرابی ہے

آغازِ عشق میں یہ مزہ ہے کہ اے جنوں
دامن نئے نئے ہیں گریباں نئے نئے

آوارگی کی سیر ہے اور آمدِ بہار
سودا ہے تازہ تازہ بیاباں نئے نئے

جوہر تو مجھ میں تھے ملکوتی خصال کے
انساں بنا کے کیوں مری مٹّی خراب کی

پروفیسر رالف رسل / سحر انصاری

اردو ادب کی تاریخ کس طرح نہیں لکھنی چاہیے؟

میں ۱۹۶۵ء میں پاکستان پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ محمد صادق نے اردو ادب کی ایک نئی اور مبسوط تاریخ انگریزی زبان میں لکھی ہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اسے شائع کیا ہے۔ میرے دل میں اس کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ ۴۹-۱۹۴۶ء میں ایک طالبِ علم کی حیثیت سے میں نے رام بابو سکسینہ کی تاریخِ ادب اردو مطبوعہ ۱۹۲۷ء اور ٹی۔ گراہم بیلی کی تاریخِ ادب اردو مطبوعہ ۱۹۳۲ء کا مطالعہ کیا تھا۔ اس وقت تک انگریزی زبان میں دستیاب ہونے والی یہی دو تاریخیں تھیں۔

میں نے روز افزوں حیرت اور خفگی کے ساتھ دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا۔ حیرت اس بات کی تھی کہ اردو ادب کے بارے میں اس قدر ناقص رائے رکھنے والے آخر اس کی تاریخ کیوں لکھنا چاہتے ہیں اور خفگی اس بنا پر کہ ایک ایسا طالبِ علم جو ابھی سہولت کے ساتھ اردو پڑھنے سے قاصر ہے، پہلے ہی مرحلے میں ان کتابوں کی طرف متوجہ ہوگا اور میری طرح اردو ادب کے مطالعے کی راہ میں انھیں حوصلہ شکن پائے گا۔ لہٰذا مجھے امید تھی کہ یہ نئی کتاب بہت مختلف ہوگی۔ نیز یہ کہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اسے شائع کیا ہے اور انھوں نے بدیہی طور پر اس کی اشاعت کی منظوری سے قبل کسی موزوں شخص سے اس کا مسودہ پڑھوایا ہوگا۔ ان شواہد کی روشنی میں میری توقعات بے جا نہ تھیں۔

جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو میری توقعات نا امیدی اور غصّے میں تبدیل ہوگئیں میں نے پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ خود سے یہ سوال کیا کہ آخر یہ لوگ اس طرح کیوں لکھتے ہیں؟ آخر انھیں اپنی تحریر کی اتنی واضح غلطیاں دکھائی کیوں نہیں دیتیں؟ اور میں نے اپنے آپ سے وعدہ کر لیا کہ میں ایک مقالہ اس موضوع پر لکھوں گا کہ اردو ادب کی تاریخ کس طرح نہیں لکھنی چاہیے یا کم از کم انگریزی بولنے والے قارئین کے لیے کس طرح نہیں لکھنی چاہیے۔

آیئے پہلے سکسینہ کے لب و لہجہ کا جائزہ لیں جس پر مجھے سب سے زیادہ اعتراض ہے۔ وہ ایک باب (باب سوم) میں شاعری کا تعارف اس عنوان کے تحت کراتے ہیں:

"اردو شاعری کی عام خصوصیات" اس کے نو صفحات میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ "قدیم اردو شاعری، فارسی شاعری کی نقّالی تھی۔" نیز یہ کہ:

"اس کا دائرہ بہت محدود ہے کیونکہ وہ اب تک فارسی کے فرسودہ و پامال مضامین

میں غرق ہے اور فارسی شاعری کے پیش پا افتادہ تشبیہات و استعارات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ ان کا قطعاً کوئی تعلق اس کی جنم بھومی ہندوستان سے نہیں۔۔۔"

"اس حریصانہ جذب اور کورانہ تقلید سے یہ بُرا نتیجہ پیدا ہوا کہ اردو شاعری سے اصلیت مفقود ہو گئی اور بسا اوقات ابتذال پیدا ہو گیا۔"

یہ آخری فقرہ اس پیراگراف کی پہلی سطر ہے جس کا عنوان رکھا گیا ہے " اس تقلید کے نقائص " اور تین صفحے (۲۳۔۲۵) ان نقائص کی فہرست اور تشریح کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ پیراگراف کی ذیلی سُرخیاں یہ ہیں:

۱۔ اس کی وجہ سے اردو شاعری سے اصلیت مفقود ہو گئی ہے۔

۲۔ اس نے اردو شاعری کو صنائع بدائع کا پابند کر دیا ہے۔

۳۔ اس نے اردو شاعری کو رسمی بنا دیا ہے۔

۴۔ اس سے اردو میکانکی، مصنوعی اور مبتذل ہو گئی ہے۔

۵۔ اس کی بنا پر اردو شاعری سے اصلیت مفقود ہو گئی ہے۔ (جی ہاں۔ ایک بار اور۔ پ۔ ر)

یہ آخری پیراگراف اس لائق ہے کہ پورا کا پورا نقل کیا جائے۔

"تقلید نے نہ صرف شاعری کو رسمی، مبالغہ آمیز، مصنوعی اور مبتذل بنا دیا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر پہلو یہ ہے کہ اسے غیر فطری بنا دیا ہے۔

فارسی شاعری میں کم عمر لڑکے سے مرد کی محبّت کے جو گھناؤنے اور قبیح مضامین تھے ان کی نقل بھی کسی معذرت یا جواز کے بغیر کی گئی۔ لڑکے کو داشتہ گردانا جاتا ہے اور اس کے حسن کی ایسے مبتذل انداز میں تعریف کی جاتی ہے کہ ذہن کراہیت کرنے لگے۔" (ص ۲۵)

وہ برابر زیادہ تر اسی پُر تحقیر انداز میں اردو کی اہم اصنافِ شاعری پر تبصرہ کرتے چلے جاتے ہیں اور پڑھنے والے کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب وہ آخر میں آدھا صفحہ اس مضمون کا پڑھتا ہے کہ:

" باوجود اُن نقائص کے جو اُوپر بیان ہوئے ہیں اردو شاعری جذباتی شاعری ہے اور ہمارے فطری جذبات میں کشش پیدا کرتی ہے۔ ماسوا اس کے وہ شیریں اور لطیف اور اپنے طرزِ خاص میں بے مثل ہے۔" (ص ۳۱)

گراہم بیلی کا لب و لہجہ بھی کم و بیش ایسا ہی ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں:

" اردو شاعری کا دائرہ ابھی تک بہت محدود ہے۔" (ص ۱۰۱) اور غزل کو جسے مجھ سمیت اردو ادب کے بہت سے شیدائی عظیم ترین کارنامہ سمجھتے ہیں، نشانۂ تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ

" یہ موضوع یعنی عشق کی اُکتا دینے والی یکسانیت کا شکار ہے" (ص ۴۱)

(یہ درست ہے کہ ان کی یہ شکایت " عہدِ حاتم " کی غزل کے بارے میں ہے لیکن وہ حاتم کے جانشینوں، میر

اوران کے معاصرین کے بارے میں بھی ہمیں یہی بتاتے ہیں کہ "ان کے پاس کہنے کو کوئی نئی بات نہیں ہے۔" (ص ۴۲) اور یہ کہ مصحفی اور انشا کے زمانے میں بھی (جو میر کے بعد کا ہے) "کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی" (ص ۴۲) اور اس میں شک نہیں کہ "موضوع کی یکسانیت" آج بھی غزل میں پائی جاتی ہے۔

صادق نے بھی اسی روایت کی پیروی کی ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ "غزل، اصنافِ ادب میں مراتب کے اعتبار سے بہت نچلے درجے پر آتی ہے۔" (ص ۲۰) (وہ یہ نہیں بتاتے کہ یہ مراتب کیا ہیں اور دوسری اصناف کو ان میں کہاں کہاں جگہ دی گئی ہے۔) بہرکیف، "بہت نچلے" کے الفاظ خاصے واضح ہیں۔

ان تینوں کتابوں کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اردو اور انگریزی ادب کے مابین موازنہ مسلسل جاری رہتا ہے اور اردو کے ضمن میں ان کا رویّہ ہمیشہ تحقیر آمیز ہوتا ہے۔ یہ موازنے عمومی نوعیت کے بھی ہیں اور خصوصی نوعیت کے بھی۔

چنانچہ سکسینہ رقم طراز ہیں کہ:

> "اردو شاعری کا دائرہ محدود ہے۔ قدرتی مناظر جو شعرائے مغرب کے دلوں میں عجیب عجیب امنگیں پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے اردو شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے۔ اردو میں برائنٹ (یہ کون صاحب ہیں؟ ان کا میں نے کبھی نام نہیں سنا۔ پ ر) وہٹیئر اور ٹامسن کی طرح کے شعرا کا پتا نہیں اور نہ ورڈسورتھ کا ایسا کوئی نیچر کا عاشق ہے۔" (ص ۲۹)

یا "مثنویات کے بارے میں کہا جاتا ہے (کون کہتا ہے؟ پ ر) کہ یہ اردو میں ایپک اور ڈرامے کا جواب ہیں، لیکن ہماری رائے میں مثنوی ان عظیم اصنافِ ادب سے بہت پیچھے ہے.... ....جو لوگ ڈرامے کے فن سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مثنوی اور ڈرامے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" (ص ۳۰)

اسی طرح گراہم ہیلی ہمیں اطلاع دیتے ہیں:

> "رزمیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مشکل ہی سے اس کا وجود پایا جاتا ہے.... ڈرامائی شاعری تو سرے سے ہے ہی نہیں۔ اگر آج کے اردو ادیب شیکسپیئر، ملٹن، ٹینی سن اور براؤننگ کا مطالعہ کریں تو وہ اپنے قارئین کے لیے ایک مکمل نئی دنیا تخلیق کر سکتے ہیں۔" (ص ۱۰۱-۱۰۲)

صادق کے ہاں بھی یہ موازنہ اتنے ناپسندیدہ انداز میں دہرایا گیا ہے۔ تقریباً ہر ادیب کا مقابلہ اور موازنہ یورپی ادیبوں سے کیا گیا ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کی اشاعتِ دوم (۱۹۸۴ء) پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے اس کی ایک مثال پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اکبر کے ہاں ڈکنس اور فیلڈنگ کی سی اُمنگ نہیں ہے۔ وہ دو انتہاؤں کے مابین

کھڑے ہیں۔ وہ نہ تو ارسٹوفینز ہیں نہ سروانٹس اور نہ رابلے۔ اس سے کم تر درجے پر نہ ڈکنس ہیں نہ میریڈتھ بلکہ تھیکرے اور سولٹفٹ کا امتزاج ہیں۔" (ص ۴۰۳-۴۰۴)

میں نے اس پر یہ تبصرہ کیا تھا:

"یہ الفاظ ہمیں اس کے سوا کچھ نہیں بتاتے کہ اکبر میں اُمنگ کی کمی تھی۔ نیز ڈاکٹر صادق ہمیں یہ بھی نہیں بتاتے کہ ان کی "دو انتہائیں" کیا ہیں۔ یا اس مرعوب کن فہرست میں شامل شدہ ادیبوں کی خوبیاں خود ان کی نگاہ میں کیا ہیں یا ان کے نزدیک آخری "دونوں کے امتزاج" نے کیا چیز پیدا کی۔ مغربی متوازیت کی یہ مسلسل صف آرائی اور (اکثر و بیشتر) موازنے (جو اردو کے حق میں ہمیشہ اہانت آمیز ہوتے ہیں) نہ صرف اشتعال انگیز ہیں بلکہ ہر ہر قدم پر وہ موازنے کے حق بجانب ہونے کا تاثر دیتے ہیں جو کہ قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص انیسویں صدی کے انگریزی ناول کی تاریخ لکھ رہا ہو اور ہر صفحے پر یہ اعلان کر رہا ہو کہ ڈکنس ٹالسٹائے کا یہ گیسکل، دستوفسکی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ نہیں کر سکتا، لیکن کون سا معقول نقاد ان کا موازنہ کرتا ہے؟ (آرڈیل نے بجا طور پر یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا آپ ڈکنس کو ٹالسٹائے پر فوقیت دیتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی یہ پوچھے کہ کیا آپ گلاب پر کباب کو ترجیح دیتے ہیں؟ — ویسے ان کی افادیت کہیں ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتی۔)"

اس مقالے میں یہ بات موضوع کے عین مطابق ہوگی کہ اس عبارت کا غائر مطالعہ کر کے یہ دیکھا جائے کہ صادق ہمیں بتا کیا رہے ہیں؟

سب سے پہلے تو وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ خود ان سب مصنفین کو پڑھ چکے ہیں یا کم از کم ان کی اتنی تحریریں ضرور پڑھ رکھی ہیں کہ ان کے خاص خاص پہلوؤں پر فیصلہ صادر کر سکیں۔ مجھے ان کی کارکردگی پر شک نہیں لیکن قاری کے سامنے تو محض ان کے الفاظ ہیں اور اسے انھیں پر بھروسا کرنا پڑے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی سے اس کا کیا تعلق ہے؟

دوسرے وہ ہمیں یہ بھی بتا رہے ہیں کہ ہم بھی ان کی اور دوسرے تعلیم یافتہ افراد کی طرح ان تحریروں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ ان سب مصنفین کی بنیادی خوبیوں سے واقف ہیں چنانچہ ان کو گنوانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ممکن ہے ہم نے پڑھی ہوں، ممکن ہے نہ پڑھی ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے (پچاس سال قبل اسکول کے زمانے میں یونانی زبان میں) ارسٹوفینز کی ایک تمثیل پڑھی تھی (مینڈک)۔ میرے مزید مطالعے کی تفصیل یہ رہی۔ سروانٹس کا "دان کیخوتے"، (لیکن ان کی دوسری تصانیف نہیں)، رابلے کی گارگنتوا اور پنتاگروئیل، ڈکنس کے پندرہ ناولوں

میں سے تو ناول، میریڈیتھ کی کوئی چیز نہیں، تھیکرے کا ایک ناول (وینٹی فیر) اور سوئفٹ کا گلیورز ٹریولز، اے ماڈسٹ پرو پوزل اور کچھ نظمیں اور نثر۔ میرا تعلق صادق ہی کی نسل سے ہے اور ہم اس خواہش کے ساتھ پروان چڑھے کہ وہ سارا ادب پڑھا جائے جس کی عزت و تکریم کرنے کا سبق ہماری نسل کو سکھایا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود آپ محسوس کریں گے کہ میں صادق کی فہرست میں پورے نمبر حاصل کرنے سے قاصر ہوں۔ شاید نوجوان نسل جس کا مطالعہ ہم سے مختلف ہے (ضروری نہیں کہ ہم سے خراب ہی ہو) شاید اس سے بھی کم نمبر حاصل کرے اور اس امر کا بھی امکان ہے کہ ہم اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہوں اور صادق کی اس شاندار فہرست سے بہر حال خارج ہی رہیں۔ ہم ایسے بھی ہو سکتے ہیں اور نہیں بھی۔ ذاتی طور پر میں نہیں ہوں۔ کسی نے بھی ہر وہ چیز نہیں پڑھی جس کے پڑھنے کی خواہش اس کے دل میں ہو۔ کیونکہ کتابیں پڑھنے کے علاوہ بھی زندگی میں بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور مطالعے کو تو چھوڑیے۔ اس کے سوا بھی جو کچھ آپ زندگی میں کرنا چاہتے ہیں، سب کا سب نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہر شخص کے مطالعے میں رخنے ہوتے ہیں۔ اس پر قدرے تاسف ہو تو ہو لیکن یہ باعث ندامت ہرگز نہیں۔ پھر یہ کہ یہ فیصلے جو صادق، میں یا کوئی اور ادیبوں کی بابت کرتا ہے، دل چسپ ہو سکتے ہیں، لیکن ان کا اکبر الہ آبادی سے کیا تعلق ہے؟ صادق نے موازنے کے لیے جن تصانیف کی فہرست پیش کی ہے ان میں سے دو تہائی کے بارے میں فیصلہ کرنے کی میں مقدرت رکھتا ہوں لیکن خود ان میں سے کسی کا بھی کسی دوسرے سے موازنہ کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں۔ اکبر سے موازنہ تو ایک طرف رہا، جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں سوئفٹ کے سوا اس فہرست میں کوئی اور نام ایسا نہیں جس کا حوالہ موزوں نظر آتا ہو۔ اور یہ حوالہ بھی یکسر غیر ضروری ہے۔ اکبر کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہیے وہ کسی بھی دوسرے مصنف کے خواہ کوئی بھی ہو، حوالے کے بغیر کہی جا سکتی تھی۔ (اور کہیں بہتر طریقے سے کہی جا سکتی تھی) اور اسی پر اکتفا نہیں ہوا ہے۔ اس کے پہلے ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے یہ رائے دی تھی:

> "دو صفحات (۳۰۸ - ۳۱۰) میں ہمیں اکبر کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ایسے ہیں جیسے انگلستان میں ٹریکٹیرین۔ نیز یہ کہ ایس۔ اے بروک نے جو کچھ میتھو آرنلڈ کے بارے میں کہا ہے وہ اکبر پر بھی صادق آتا ہے۔ پھر یہ کہ "ان کے طنز سے کارلائل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے"۔ اس سے مجھے وہ رائے یاد آ گئی جو ٹرولوپ نے تھیکرے کے بارے میں لکھی ہے۔"

یہ سارے موازنے دوسرے ایڈیشن میں بھی موجود ہیں (ص ۳۹۶ - ۳۹۷) ہو سکتا ہے قارئین مرعوب ہو جائیں لیکن زیادہ امکان اس کا ہے کہ وہ مایوس بلکہ مشتعل ہوں گے۔ اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گی کہ کاش اکبر کے بارے میں کسی ایسے شخص نے لکھا ہوتا جس کی توجہ اس قدر نہ بھٹک رہی ہوتی۔

اگر آپ اکبر پر لکھنا چاہتے ہیں تو اکبر کا مطالعہ کیجیے اور لوگوں کو وہ بتائیے جو وہ اکبر کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں اور پڑھنے والوں کے متعلق یہ گمان رکھیے کہ ایک قابلِ توجہ ادیب کے بارے میں وہ ایسی باتیں جاننے کے

خواہاں ہیں جواب تک ان کے علم میں نہیں آئی ہیں۔ اس طرح شاید آپ کو کسی اور ادیب کا حوالہ دینے کی سرے سے ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی اور اگر حوالہ دینا ضروری ہو تو پھر وہ ادیب ایسا ہو جس کے بارے میں آپ کو توقع ہو کہ آپ کا قاری اسے پڑھ چکا ہو گا اور آپ کا پیش کردہ حوالہ اس نوعیت کا ہو جو بجائے خود قابلِ فہم ہو اور جس سے اکبر کی تفہیم میں بھی مدد ملے۔

میں نے صادق کا تفصیل سے حوالہ دیا ہے کیونکہ علم کی نمایش کے اس طفلانہ کھیل میں انھیں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، گراہم بیلی بھی بقیہ دونوں مصنفوں کی طرح موازنے کے چکر میں رہتے ہیں لیکن وہ صادق کی طرح اپنے علم کی مستقل نمایش نہیں کرتے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ ایک ایسے انسان تھے جن کی مادری زبان انگریزی تھی اور ان کی نشو و نما برطانیہ میں ہوئی تھی، چنانچہ انھیں انگریزی ادب بلکہ انگریزی ادب کی بابت لکھی جانے والی کتابوں کے ذریعے (کیونکہ صادق نے انھیں کا زیادہ حوالہ دیا ہے) اپنے علم کے مظاہرے کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی، لیکن سکسینہ بالکل صادق کی طرح علم کی نمود و نمایش کی طفلانہ خواہش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرہاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اس نے ایک اور ایتھاس (ATHOS) کھودی۔" (ص ۲۳-۲۴) حالانکہ موزوں انداز میں بات یوں کہی جا سکتی تھی کہ اس نے پہاڑ کھودنے کا کام کیا۔ "ایک اور ایتھاس" کی کیا تک ہے؟ اس کا واحد سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انھیں قدیم یونان کے بارے میں بھی کچھ واقفیت ہے لیکن کیا اردو کے کسی طالبِ علم کے لیے اس کا جاننا ضروری ہے؟ یہ بات بھی بڑی دل چسپ ہے کہ ایک شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ اردو کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں عجمی حوالے ملتے ہیں اور اس سے یہ غیر ہندوستانی ہو جاتی ہے (گویا پیراڈائز لاسٹ کی اس لیے غیر انگلستانی کہہ کر مذمت کی جائے کہ اس میں عبرانی، یونانی اور رومن روایات سے استفادہ کیا گیا ہے)۔ ایسے استعارے کا استعمال جائز سمجھتا ہے جس کے لیے یونانی اور لاطینی حوالوں سے واقفیت ضروری ہے۔ "ایتھاس" کا تذکرہ وہ اس وقت کر رہے ہیں جب انھیں محض "ایک پہاڑ" کہنا ہے اور "وینس اور بیکس" (ص ۲۸) کا تذکرہ اس موقع پر چھیڑ دیتے ہیں جب ان کی مراد محض "محبت اور شراب" سے ہوتی ہے۔

گراہم بیلی اور ان دو بقیہ مصنفین میں یہ بات مشترک ہے جسے وہ ایک بدیہی حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ کوئی ادب جو قابلِ ذکر ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جسے ان کی اور میری نسل کے انگریزی داں قارئین اہمیت دیتے ہیں، نیز یونان، روم اور قرونِ وسطیٰ کے یورپ اور نشاۃ ثانیہ کا وہ ادب جو ترجمے کی صورت میں انگریزی داں طبقے کے لیے خاصے عرصے سے موجود ہے۔ خیر ہر شخص کو اپنا نقطۂ نظر رکھنے کا حق ہے لیکن یہ مخصوص نکتہ ایسا ہے کہ اس کے تحت آپ اردو ادب کی کسی بھی قابلِ ذکر تاریخ لکھنے کے لیے نااہل قرار پاتے ہیں۔ لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اردو ادب انھیں کیا کچھ دے سکتا ہے، نہ یہ کہ ہر صفحہ پر دو یا تین بار وہ بتایا جائے جو وہ نہیں چاہتے۔ انگریزی (یا کسی بھی زبان کے ادب) سے موازنہ یکسر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔

آصف فرخی

محمد حسن عسکری کے خطوط

محمد حسن عسکری کی وفات کو لگ بھگ ایک دہائی کا عرصہ گزر گیا، لیکن اپنی تحریروں کی تنقید، تذکرے اور اپنے ادبی افکار کے اثر و نفوذ کے سبب معاصر ادب کے منظر نامے پر وہ ایک دیو قامت سائے کی طرح چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شعر و ادب کے کتنے ہی موہوم گوشے اور ادبی تجربے کے کتنے ہی ابعاد ایسے ہیں جن کی موجودگی کا احساس ہمیں اگر ہوا ہے تو عسکری صاحب کی تحریروں کے ذریعے سے۔ وہ مغرب کا جدید ادب ہو یا اردو کی شعری روایت، عسکری صاحب کا ادبی شعور ایسی گیرائی اور حساسیت سے عبارت ہے کہ وہ نہ صرف قارئین کے ذوقِ نظر کی تربیت کا سامان بہم پہنچاتے ہیں بلکہ زندگی اور ادب کو باہم آمیخت کرنے کا وہ نایاب گُر بھی سکھاتے ہیں کہ ادب روحانی تجربہ کیوں کر بنتا ہے۔ انسانی روح کا وہ تجربہ جو اس عہد کے ادب میں ظاہر ہوا ہے، اس کی پیچ در پیچ تہہ داری کا احساس، اور اس پیچ و خم میں نہاں، انسان کے آشوب کا جیسا شعور عسکری صاحب کو تھا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عسکری صاحب کتابوں کو الٹ پلٹ کر کاغذ سیاہ کرنے والے نقادِ محض نہیں وہ ایسے ادبی مفکر تھے کہ ان کی زندگی آموز اور خرد افروز تحریریں ایسی قوت کی حامل نظر آتی ہیں کہ جیسے تہذیب سازقوت کہنا بے جا نہ ہوگا۔ انگریزی نقاد ایف آر لی وس (LEAVIS) نے جو عسکری صاحب کی طرح ڈی ایچ لارنس کا دلدادہ تھا، کہا ہے کہ ادبی تنقید کو LIFE-FURTHERING ہونا چاہیے۔ ہمارے عہد میں بھلا ایسی حیات افزا تنقید عسکری صاحب کے علاوہ اور کس نے لکھی ہے؟ ان کی تنقید تو ان کے اس روحانی سفر کا استعارہ بن گئی ہے جس میں انھوں نے دانشِ عصرِ حاضر سے لے کر حقیقت اور روایت تک ساری منزلیں کھنگال ڈالنے کی کوشش کر کے دیکھی۔ ان کی تنقید اسی لیے ہمارے واسطے اس جہانِ معنی کی تسخیر کی کنجی ہے جہاں ہمیں ابتلا میں ڈال دینے والے سوال، شافی جوابات سے متواصل ہوتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے مظفر علی سید نے عسکری صاحب کے بارے میں سلیم احمد کی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ "محمد حسن عسکری اپنی زندگی میں ہمارے ادب کے اکیلے حاتم تھے اور ہم سب ان کے توفل" دھیمے اور نیم روشن افسانوں سے لے کر مغربی ادب کی تفہیم تک اور پھر شعری روایت کی بازیافت سے لے کر قرآنِ مجید کی تفسیر تک عسکری صاحب کی عمرِ طبیعی اور تحریریں، ان سوالوں کی جستجو کی حکایتِ لذیذ ہے کہ جن کے جواب کا ملنا ہمارے لیے شرطِ زندگی ہے۔

عسکری صاحب معاصر ادب کا حوالہ بن گئے ہیں لیکن ہماری بدنصیبی اور محرومی کہ ان کا بہت سا تحریری سرمایہ

منتشر حالت میں ہے۔ ان تحریروں کا یہ بکھراؤ جہاں ہماری ادبی ثقافت کے بارے میں کوئی خوش گوار تاثر نہیں قائم کرتا، وہاں ان تحریروں کی بازیافت ہمارے لیے ایک اہم تہذیبی فریضے کا درجہ رکھتی ہے۔ مظفر علی سیّد نے اپنی محولہ بالا تحریر میں مزید لکھا ہے کہ "ان کی وفات کے بعد معلوم ہونا شروع ہوا کہ انھوں نے کون کون سی نیکیاں کن کن دریاؤں میں ڈالی تھیں، ان میں سے چند ایک برآمد ہو چکی ہیں اور بہت سی آنے والے برسوں میں دریافت ہو کے رہیں گی۔" میرے لیے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ عسکری صاحب کے مندرجہ ذیل خطوط کسی ایسی ہی نیکی کے زُمرے میں آئیں گے بھی یا نہیں کہ جسے دریا میں ڈال دیا گیا ہو، اگرچہ یہ خطوط بھی دریاؤں کی طرح سمندر میں پہنچے اور پھر سمندر پار سے دریافت ہوئے۔ عسکری صاحب کے یہ پانچ خطوط محمد عمر میمن کے نام ہیں جو مجھے میمن صاحب کے ذخیرۂ کاغذات واقع میڈیسن یونیورسٹی وسکانسن (WISCONSIN) سے حاصل ہوئے۔ یونیورسٹی کے شعبۂ مطالعۂ جنوبی ایشیا کے دفتر میں میمن صاحب نے اپنے نام آنے والے ادیبوں کے خطوط محفوظ کر رکھے ہیں اور انھی میں سے مجھے ممتاز شیریں کے دو خطوط بھی حاصل ہوئے تھے۔ ("قومی زبان" جنوری ۱۹۸۹ء) میڈیسن کے سفر کے دوران مجھے محض اتّفاقاً ان خطوط کا علم ہوا اور جناب محمد عمر میمن کی مہربانی سے مجھے ان کی نقول حاصل ہوئیں جو قارئین "قومی زبان" کی نذر ہیں۔

میمن صاحب نے مجھے بتایا کہ جن دنوں وہ کراچی میں پڑھتے تھے اور افسانے لکھتے تھے تو عسکری صاحب سے ان کی واقفیت تھی جو چند ایک سرسری ملاقاتوں سے آگے نہ بڑھی۔ میمن صاحب کے امریکہ منتقل ہو جانے اور ابنِ تیمیہ رحؒ پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے بعد (جس کی تکمیل اور اشاعت کے بارے میں ان خطوط میں عسکری صاحب نے استفسار کیا ہے۔) پاکستان کے ایک سفر کے دوران تجدیدِ ملاقات ہوئی اور یہ پانچ خطوط اسی کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ یہ خطوط بالکل نجی نوعیت کے ہیں لیکن ان میں سے چوتھا خط، جو ترجمۂ تفسیر کے بارے میں ہے وہ تو خیر پورے کا پورا لیکن دوسرے خطوط بھی ایسے بلیغ اشارے اور فقرے (مثلاً عزیز احمد کے بارے میں ایک فقرہ) لیے ہوئے ہیں جو ادب کے طالبانِ علم کے لیے معنی خیز ہیں۔ افسوس کہ عسکری صاحب نے جس تفسیر کے لیے اتنی زمین صاف اور ہموار کی تھی وہ ادھوری رہ گئی۔ اس کے مکمّل شدہ اجزا رسالہ البلاغ میں قسط وار شائع ہو چکے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی صاحب انھیں یک جا کر کے شائع کر دیں۔

تفسیر کے علاوہ ممکن ہے ان خطوط میں کوئی ایک آدھ مقام اور وضاحت طلب ہو۔ یہ خطوط جس سوانحی مسالے کا مواد فراہم کرتے ہیں اس کو بروئے کار لانا یا جن باتوں کا ذکر موجود ہے ان کی تفصیل فراہم کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ حاشیے کے طور پر میں محض اتنی سی معلومات دے سکتا ہوں کہ خطوط میں جن اطہر صاحب اور ناصر کا ذکر ہے وہ علی الترتیب اطہر صدّیقی اور ناصر بغدادی ہیں۔ مرحوم اطہر صدّیقی رسالہ "سات رنگ" کے مدیر رہے جس میں عسکری صاحب کے بعض اہم مضامین شائع ہوئے۔ انھوں نے داستانوں کے بارے میں ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا جس کے بعض اجزا شائع ہو چکے ہیں۔

افسانہ نگار اور ناقد ناصر بغدادی عسکری صاحب کے شاگردوں اور رفقا میں سے ہیں۔ بہتر تو یہی ہوتا کہ عسکری صاحب کے رفقا میں سے کوئی ایسے تمام خطوط کو جمع کرتا اور وضاحت طلب امور پر حواشی لکھنے کے ساتھ ساتھ

ان خطوط کا پس منظر بھی بتاتا۔ حُسنِ اتفاق سے یہ خط مجھے مل گئے اور میں نے یہ جان کر انھیں اٹھا لیا کہ میرے معنوی استاد اور مشفق مہربان کی یادگار ہیں۔ ان خطوط کو دیکھ کر مجھے رلکے کے وہ خطوط یاد آ گئے جو اس نے ایک نوجوان شاعر کے نام لکھے تھے۔ رلکے کے انتقال کے بعد اس خط کو مرتب کرتے ہوئے نوجوان شاعر نے مختصر الفاظ میں ان خطوط کا پس منظر بتایا اور لکھا کہ یہ سب باتیں غیر اہم ہیں۔ اصل چیز تو رلکے کے خطوط ہیں اور رلکے جب کچھ کہے تو ہم ایسے لوگوں کا چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ اس تمہید کے بعد عسکری صاحب کے یہ خط حاضر ہیں۔

۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

برادرم، السلام علیکم ورحمتہ اللہ

عنایت نامہ ملا۔ آپ کی زحمت کا شکریہ۔ میں ۱۴ر کو لاہور سے واپس آیا ہوں۔ ہم لوگ سوچ ہی رہے تھے کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ آپ کی خیریت معلوم ہو کر خوشی ہوئی۔ دعا ہے کہ اب آپ مع خاندان خوش و خرم ہوں۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کا خط اردو اور انگریزی دونوں میں اتنا خوبصورت ہے اور آپ عربی بالکل عربوں کی طرح لکھتے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنے خوش خط ہوں گے۔

ASIN کی کتابوں کی فہرست بہرحال کام دے گی۔ حضرت ابنِ عربیؒ پر ان کی جو کتاب ہے وہ میں نے پڑھی تو نہیں، مگر اندازہ ہے کہ اچھی نہیں۔ جیسا کتاب کے نام سے ظاہر ہے، انھوں نے اسلام اور ابنِ عربیؒ دونوں کو مشرف بہ عیسائیت کیا ہے۔ ڈانٹے والی کتاب میں لکھ دیا ہے کہ امام شعرانیؒ نے "الیواقیت والجوہر" میں ابنِ عربیؒ کی تکفیر کی ہے۔ میں نے "یواقیت" دیکھی تو معاملہ الٹا ہے۔ CORBIN کی کتاب میں فرانسیسی میں پڑھ چکا ہوں۔ انتہائی غلط ہے۔ میں نے اس کے بارے میں صرف ایک فقرہ لکھا تھا نے ایک رسالے میں مجھے چار صفحے کی گالیاں دیں۔ بہرحال ایران میں ان کا بہت اثر ہے، اور خصوصاً اسمٰعیلی لوگوں میں۔ انھوں نے شہاب الدین سہروردی مقتول پر بہت کچھ لکھا ہے، میں نے پڑھا نہیں کیونکہ میں فلسفہ نہیں جانتا۔ مگر ابھی لاہور میں ۱۹۲۰ء کا ایک اردو ترجمہ اور شرح "حکمت الاشراق" دیکھی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اپنے یہاں لوگ کتنے عمدہ کام کر چکے ہیں، اور ہمیں خبر تک نہیں۔

ابھی کوئی مضمون تو نہیں لکھا۔ مگر ارادہ ہے۔ چھٹیاں امتحان کی کاپیاں دیکھتے گزریں۔ اور ابھی کام باقی ہے۔ طہٰ صاحب بھی امتحان کے کام میں مصروف ہیں۔

شب خون از سرِ نو آنے لگا ہے۔ فاروقی صاحب نے اپنی نظموں کا مجموعہ بھی بھیجا تھا۔ وہ تو ابھی تک نہیں پہنچا۔

اچھا ہوا کہ احسن صاحب نے آپ کو خط لکھ دیا۔ مگر میرے پاس اب تک ان کا خط نہیں آیا۔ ممکن ہے ڈاک میں ضائع ہو گیا ہو۔ وہ بھی اب انگریزی چھوڑ کر اردو ادب کے مطالعے کی طرف مائل ہیں۔ اس لیے آپ دونوں کے درمیان ایک مشترکہ شغف بھی پیدا ہو گیا۔

امید ہے کہ آپ کے مقالے کا کام چل پڑا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سُنا ہے کہ CORBIN کی نگرانی میں چند مصری اور ایرانی طالب علموں نے مل کر حضرت ابنِ عربیؒ کی BIBLIOGRAPHY تیار کی ہے جو دو یا تین جلدوں میں پیرس سے شائع ہوئی۔ اگر کہیں نظر آئے تو کتاب کا نام اور ناشر کا پتہ مجھے لکھ دیجیے گا۔

خدا کرے کہ جلد ہی سے آپ کو ڈگری مل جائے تاکہ پڑھنے لکھنے کا کوئی پروگرام بنائیں اور آپ کی عربی دانی سے میں بھی فائدہ اٹھاؤں۔

اطہر صاحب اور ناصر سے آپ کا سلام کہہ دوں گا۔

والسلام۔

مخلص
محمد حسن عسکری

کراچی ۱۴ر فروری ۱۹۷۵ء

برادرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے ۱۴ر دسمبر کے خط کا جواب آج دے رہا ہوں۔ اس میں میرے تساہل کو دخل نہیں۔ ڈیڑھ روپیہ کا ایروگرام ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ دعا ہے کہ آپ مع خاندان خوش و خرّم ہوں۔

جی ہاں، گانے تو اور بھی بہت سے ٹیپ کیے ہیں۔ مگر آپ کو کیسے بھیجوں؟ کوئی جانے والا ملے تو آسانی ہو۔

آپ کی کتاب کب شائع ہو رہی ہے؟

اور کیا مصروفیتیں ہیں؟ امید ہے کہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری ہو گا۔

اطہر صاحب کی طرف بہت دن سے جانا نہیں ہوا۔ آپ کا سلام پہنچا دیا تھا اور صدیق ارشد کو بھی۔ دونوں آپ کو سلام کہتے ہیں۔

ناصر بغدادی صاحب کی خیریت دوسروں سے معلوم ہو جاتی ہے۔

والسلام التام علیکم

مخلص
محمد حسن عسکری

۲۹ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

برادرم، السلام علیکم ورحمتہ اللہ

یاد آوری کا شکریہ۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ جواب دیر میں دیتے ہیں، مگر خط کا انتظار رہتا ہے اور آپ اکثر یاد آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرّم رکھے۔

انشاء اللہ آپ کے لیے استاد بندو خاں کے گانے ٹیپ کرانے کا انتظام اب ہو جائے گا۔ کوئی آنا جانا ہو تو پندرہ دن پہلے اطلاع دیجیے گا۔

خدا کرے آپ کی کتاب جلد شائع ہو جائے۔ پروف کے علاوہ اور کیا لکھ پڑھ رہے ہیں؟ آپ تو ماشاء اللہ کسی نہ کسی کام میں لگے ہی رہتے ہیں۔

احمد علی صاحب کی تقاریر اور ان کے تاثر کے بارے میں تفصیل سے لکھیے۔

فاروقی صاحب نہیں آسکے۔ صدیق ارشد سے ڈیڑھ مہینے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کی بیوی بیمار ہیں۔ اطہر صاحب بھی علیل رہے ہیں۔

دو تین مہینے سے میں مفتی محمد شفیع صاحب قبلہ کی تفسیر "معارف القرآن" کا ترجمہ اردو سے انگریزی میں کر رہا ہوں۔ افریقہ وغیرہ میں اور خود ہمارے یہاں بھی انگریزی کی تفسیر کی شدید ضرورت ہے اور مانگ بھی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی معقول مترجم دست یاب ہو جائے، مگر علما سے لوگ کنارہ کش ہیں۔ کوئی تیار نہیں ہوا۔ مجھ میں تو اس کام کی ذرا بھی صلاحیت نہیں، لیکن گندم اگر بہم بھُس غنیمت است کے اصول کے مطابق آخر کار یہ ذمے داری قبول کر لی۔ میری نا اہلیت کی وجہ سے ترجمے کا کام بہت آہستہ ہو رہا ہے۔ ابھی سورہ بقر کی پہلی پانچ آیتیں ختم کی ہیں، لیکن تفسیر کی اتنی شدید ضرورت پیش آرہی ہے کہ مفتی صاحب قبلہ کے رسالے "البلاغ" میں آٹھ صفحے ہر مہینے شائع ہونے لگے ہیں۔ پہلی دو قسطیں آچکی ہیں جو آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے دوست ہی میری غلطیاں اور خامیاں بتائیں اور اگر تفسیر میں کسی اضافے کی ضرورت ہے تو وہ بھی بتائیں (فی الحال طباعت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ مگر اب چھپائی کی درستی کا انتظام بھی کریں گے) میں نے بہت سے دوستوں کو پہلی قسط بھیجی، مگر سوائے تعریف کرنے کے کسی نے کوئی اصلاح نہیں کی نہ مشورہ دیا۔ البتہ ایک میرے چھوٹے بھائی نے دو چار جگہ زبان کی اصلاح کی۔ اب آپ سے گزارش ہے کہ غور سے پڑھ کر مشورہ دیجیے۔

ترجمے کے اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) انگریزی زبان ایک طرف تو دنیا میں پھیل رہی ہے اور دوسری طرف مر رہی ہے۔ اس لیے زبان و بیان کی خوبیاں پیدا کرنے کے بجائے کوشش یہ رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اور کم پڑھے ہوئے لوگ بھی آسانی سے سمجھ سکیں۔ دوسری طرف بیان کی وضاحت اور صحت بھی ہو۔ تاکہ دینی معاملات میں اشتباہ

کی گنجائش نہ رہے۔

(۲) انگریزی کے وہ الفاظ جو ہمارے کام کے ہیں اپنے معنی کھو چکے ہیں۔ اس لیے انگریزی کے عام مذہبی محاورات سے بچ کر عام الفاظ میں بات کہی ہے۔ اصلی چیز یہ ہے کہ خلطِ مبحث نہ ہونے پائے۔

(۳) پہلے خیال تھا کہ موجودہ زمانے کی ذہنی ضروریات کے لحاظ سے حاشیے بڑھائے جائیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ جتنے سوال آج کل پیدا ہو سکتے ہیں ان کے جواب فی الاصل مفتی صاحب کی تفسیر میں موجود ہیں۔ اور ایک آدھ اصطلاحی لفظ یا فقرہ بڑھانے سے کام چل سکتا ہے۔ مثلاً EXISTEUTIALISM وغیرہ کا صراحتاً روکرنے کی ضرورت نہیں، ABSURD وغیرہ کا حوالہ دینا کافی ہے، جو لوگ واقف ہیں وہ خود سمجھ جائیں گے۔ جو لوگ واقف نہیں انھیں بتانا بے کار ہے۔

(۴) بعض ایسی گمراہیاں اور غلطیاں ہیں جو زیادہ رواج پا چکی ہیں ان کے بارے میں تفصیلی نوٹ بھی دینے کا ارادہ ہے۔ مثلاً آج کل سارے مذاہب کی کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں جنھیں ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان پڑھ بھی رہے ہیں۔ اس معاملے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت تفصیل سے کر دی ہے۔

(۵) مفتی صاحب نے کلام اور تصوّف کے مسائل چھوڑ دیے تھے، مگر آج کل نوجوانوں میں تصوّف سے ملتی جلتی چیزوں کا زور ہے اور کج فہمی عام اور شدید ہے اس لیے مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر "بیان القرآن" میں سے مسائل السلوک اور کلام کے مسائل لے کر انھیں بھی شامل کر دیا ہے۔ مثلاً مستشرقین کی بدولت آج کل ہمارے جدّت پسندوں میں معتزلہ کا بھی خاصا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے معتزلہ کا رد بھی خاص طور سے شامل ہو گا۔

(۶) ایرانی AVAUT GARDE ادیبوں کی تحریریں دیکھنے میں آئیں۔ ہر آدمی یہ کہہ رہا ہے کہ ہر مسئلے میں ہمیں سب سے پہلے اسلام کا نقطۂ نظر معلوم ہونا چاہیے، مغرب کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ تیور جان دیکھ کر خوشی ہوئی اور کام کرنے کی ہمّت بندھی۔

(۷) جہاں تک قرآن شریف کے ترجمے کا تعلق ہے، پہلے تو میرا خیال تھا کہ مروّجہ ترجموں میں سے کوئی اچھا ترجمہ شامل کر لیا جائے، لیکن دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بھی قابلِ اعتبار نہیں۔ یہ کام میری بساط سے بالکل باہر ہے۔ آخر یہ بتایا کہ انگریزی اور فرانسیسی کے چھ سات ترجمے سامنے رکھ کر مفتی صاحب کے صاحب زادے کی مدد سے (جو عالمِ دین بھی ہیں اور انگریزی بھی جانتے ہیں) مناسب الفاظ چُنے جائیں تاکہ صحیح مطلب ادا ہو، چاہے انگریزی خوب صورت نہ ہو۔ مثلاً "الرّحمٰن الرّحیم" کے ترجمے میں ہم نے مروّجہ الفاظ ترک کر کے میشل والساں (شیخ مصطفیٰ عبدالعزیزؒ) کے فرانسیسی ترجمے سے الفاظ لیے ہیں THE ALL MERCIFUL, THE VERY MERCIFUL تاکہ "رحمت"

کے مادّے کی وضاحت ہو جائے اور دونوں لفظوں کا فرق بھی نمایاں ہو جائے۔

خیر اب آپ کے مشوروں کا انتظار رہے گا۔

ہاں یہ تو بتائیے کہ آپ کی یونیورسٹی وظیفے دیتی ہے یا نہیں؟ میرے بھانجے نے ابھی کیمسٹری میں M.Sc. کیا ہے فرسٹ کلاس میں۔ اگر آپ کی یونیورسٹی میں وظیفوں کا سلسلہ ہو تو درخواست بھجوا دوں۔ یہ صورت ممکن ہو تو پتہ بھی لکھیے گا۔

یہ خط لکھا پڑا رہا۔ ۱۷ر نومبر میرے ترجمے کی دوسری قسط نہیں مل رہی تھی۔ آج ملی ہے تو خط ڈاک میں ڈالتا ہوں۔ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

والسّلام۔

مخلص
محمد حسن عسکری

۲۶ر مئی ۱۹۷۵ء

برادرم میمن صاحب، السّلام علیکم

آپ کے خط کا جواب بہت دیر میں دے رہا ہوں۔ معاف فرمائیے گا۔ نومبر سے پچھلے مہینے تک ہمارے رشتے داروں میں پانچ موتیں ہوئیں جن میں میرے بھائی کی بیوی اور ان کے ہم تلف بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اس لیے نظامِ زندگی درہم برہم رہا۔

پھر آپ نے ٹیپ میں اُستاد اُمراؤ بندو خاں کے گانے بھروانے کی فرمائش کی تھی۔ میں اس فکر میں رہا کہ کوئی انتظام ہو جائے۔ ہمارے حلقے میں جو صاحب اس کام کے ماہر ہیں وہ بہت مصروف رہے ہیں اور ابھی مصروف رہیں گے۔ اس لیے فی الحال تو بندوبست نہیں ہو سکا۔ آپ کے جو ملاقاتی امریکہ جانے والے ہیں وہ تو غالباً جون میں واپس چلے جائیں گے۔ اس وقت تک کام نہیں ہو سکتا۔ انشاء اللہ آئندہ میں آپ کے لیے ٹیپ تیار کرا دوں گا۔ یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ آپ جو ٹیپ لے گئے تھے وہ آپ کے کام آیا۔

عزیز احمد صاحب آئے تھے۔ ان سے سرسری ملاقات ہوئی۔ اندازہ ہوا کہ وہ تو مغربی افکار کی خاصی خدمت کر رہے ہیں۔

شاید فاروقی صاحب جون میں کراچی آئیں گے۔

اب تو آپ اپنی یونیورسٹی واپس جانے والے ہوں گے۔ اپنا پتا ضرور لکھیے گا۔ پاکستان کا رخ کب ہوگا۔

جواب تو میں ضرور دیر میں دے رہا ہوں، مگر آپ کو اکثر یاد کرتا ہوں۔

صدیق ارشد کو آپ کا سلام پہنچا دیا تھا۔ ان کا پتہ یہ ہے۔

Siddique Arshad,
Personnel Advisor,
ESSO Pakistan Fertilizer Co.
NSC Building,
Mouluvi Tamizuddin Khan Road,
Karachi.

دعا ہے کہ آپ خوش و خرّم ہوں۔
آپ کی کتاب کس منزل میں پہنچی؟
میرے ایک دوست ہیں جو باہر کے ناشرین سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی کتابوں کی چھپائی کا انتظام پاکستان میں کر دیں۔ اگر امریکہ کا کوئی ناشر ایسا کام کرنا چاہتا ہو تو مجھے بتا دیجیے گا۔
والسّلام۔ آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

مخلص
محمد حسن عسکری

کراچی ۲۷ر دسمبر ۱۹۷۵ء

برادرم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
امید ہے کہ آپ سب خوش و خرّم ہوں گے
دو تین مہینے ہوئے میں نے آپ کو خط بھیجا تھا۔ میں مفتی محمد شفیع صاحب کی تفسیر کا انگریزی میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ اس کی بھی پہلی دو قسطیں بھیجی تھیں اور آپ سے مشورہ طلب کیا تھا۔ آپ کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ مصروفیت رہی ہوگی۔ یا ممکن ہے خط ہی نہ ملا ہو۔
اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں بخیریت ہوں، اور آج کل تو یہی ترجمے کا کام کر رہا ہوں۔
آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ آپ کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ شائع ہو گیا؟ یا ابھی تک پروف دیکھ رہے ہیں؟
فاروقی صاحب نے لکھا تھا کہ شاید آجائیں، مگر نہ آسکے۔
آپ کے یہاں تو برف باری ہو رہی ہوگی۔ کراچی میں تو ابھی تک سردی کا نام نہیں۔
فرصت ملے تو چند جملے لکھ دیجیے۔
ناصر کے متعلق کوئی اطلاع نہیں۔ غالباً اپنے مقالے کے کام میں منہمک ہوں گے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اب امریکہ میں ہیں یا کینیڈا میں۔ پرسوں استاد بندو خاں مرحوم کی برسی منائی گئی۔ تقریباً ساری رات محفل چلتی رہی
والسّلام
مخلص محمد حسن عسکری

سید تقی رضا بلگرامی

دکن کا ایک صوفی منش غزل گو شاعر

قطب شاہوں کا گولکنڈہ ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ بڑے بڑے ادبا و شعرا اس خاک سے پیدا ہوئے۔ انہی میں ایک سید علی منظور حیدر آبادی بھی تھے جن کے مختصر حالات ہم یہاں لکھنا چاہتے ہیں۔

سید علی منظور کی ولادت سنیچر کے دن ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۹ ستمبر ۱۸۹۶ء کو حیدر آباد دکن میں ہوئی۔ ان کے جدِ اعلیٰ میراں سید یعقوب بندگی تھے جن کا مزار دولت آباد میں ہے۔ سید علی کے والد ماجد کا اسم شریف سید شہاب الدین اور جدِ امجد کا نام نامی سید مبارک تھا۔ منظور کے نانا سید منور بن سید سعد اللہ بن سید عبد الجلیل بہت نیک اور متورع بزرگ تھے۔ علی منظور کے لڑکپن میں ہی ان کے والد اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اس لیے یتیمی کے مصائب کا ان کو بدوِ شعور ہی سے سامنا کرنا پڑا۔ اس کا سب سے زیادہ اثر ان کی تعلیم و تربیت پر پڑا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"والد کی رحلت کے بعد کسی سے فارسی کی پہلی کتاب، کسی سے مصدر فیوض کے چند اسباق، غرض اپنے قریبی صاحبانِ علم سے برابر مستفید ہوتا رہا۔"

اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اخبار مشیر دکن، مخزن اور عصمت بھی دیکھ لیتا تھا یعنی پرورشِ ذوقِ مطالعہ کرتا رہا ؎

دل و دماغ نے صدمے بہت اٹھائے مگر
مرے مطالعے میں آسکا نہ پھر بھی فتور

اس یتیمی نے مجھ کو روشن خیال بنا دیا، جفاکش بنا دیا، بھوک پیاس کا خوگر بنا دیا۔"

سید علی منظور کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، اس لیے کہ ان کا کلام دکن اور پاک و ہند کے معیاری رسالوں مثلاً سب رس، ساقی، ہمایوں، ادبی دنیا، ہند (کلکتہ) اور پریم (لاہور) وغیرہ میں ہمیشہ شائع ہوتا رہا۔ ان کا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے بلند مرتبہ ہے۔ سادگی و پرکاری ان کے کلام کی خصوصیات ہیں اور زندگی کی صحیح ترجمانی ان کی شاعری کا مقصد۔ اپنی شاعری کے متعلق علی منظور لکھتے ہیں:

"بچپن سے شعر کہتا ہوں۔ پندرہ سولہ برس کی عمر سے تو مقامی مشاعروں میں شریک بھی ہونے لگا تھا۔ مطبوعہ گل دستے میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے۔ شعر و سخن میں حضرت

علاّمہ شمسی، حضرت احمد اللہ واصل اور حضرت سیّد نجم الدین المعی سے مدّتوں میں نے مشورہ کیا۔"

منظور صاحب غزل کے علاوہ نظم میں بھی یکساں قدرت رکھتے تھے۔ وہ بھرتی کے مصرعوں سے جھول نہیں ملاتے ان کے یہاں آمد ہی آمد ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ شاعری کا ملکہ قدرت نے ان کی فطرت میں ودیعت کیا تھا "نمود زندگی" ان کے کلام کا مجموعہ ہے جو ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن نے چھاپا ہے۔

منظور مرحوم نے نثر میں بھی کئی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ حضرت علاّمہ صفی لکھنوی اور حضرت مصحفی کے کلام کا موازنہ ان کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ان کے اسلوبِ نگارش میں بے باکی بھی ہے اور دلکشی بھی۔ وہ ہلکے پھلکے سادہ و آسان الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتے ہیں اس لیے قاری کا ذہن پوری طرح اثر قبول کرتا ہے۔ تنقید و تخطیہ کرتے وقت ان کے قلم سے کوئی لفظ غیر ثقہ اور غیر اخلاقی نہیں نکلتا اور محاکمہ کو مناظرہ یا مجادلہ نہیں بناتے۔

منظور صاحب مرحوم ایک سچے اور وسیع المشرب مسلمان تھے۔ ان کا آبائی تعلق "سادات مہدوی" سے تھا اور اس نسبت سے وہ نواب بہادر یار جنگ مرحوم و مغفور سے قرابت بھی رکھتے تھے لیکن عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مودّت اہلِ بیت علیہم السلام ان کا دین و ایمان تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

ہے معتقد انھیں کا جو پیارے نبیؐ کے ہیں — منظور بے وقوف نہیں ہوشیار ہے

عقیدت کی اس پختگی اور عزت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام کا یہ عالم تھا کہ حکومت آصفیہ حیدرآباد کے کرنسی نوٹ اور سکوں کو بیت الخلا نہیں لے جاتے تھے اس وجہ سے کہ ان پر لفظ "حیدر" لکھا ہوتا تھا۔ اللہ اللہ جس کا ظاہر اس حد تک پاک ہو، اس نے اپنے نفس میں کتنی طہارت پیدا کی ہوگی منظور صاحب مرحوم علم کے ساتھ اپنے کردار اور عمل سے بھی ایسی قد آور شخصیت تھے جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ صداقت شعاری اور حق گوئی ان کے کردار کے نمایاں جوہر ہیں۔ ان کی طبیعت میں از حد انکسار اور تواضع تھا۔ وہ اپنے خوردوں سے بھی نہایت خلق و مروّت سے پیش آتے تھے اور ان کی تعظیم سرو قد کھڑے ہو کر کرتے تھے۔ میرا ان سے قریبی ربط رہا ہے اور ان کے کردار کے خدوخال دیکھنے اور سمجھنے کا ایک طویل عرصہ تک موقع ملا۔ دبلے پتلے چھریرے بدن کے پروقار شخصیت تھے۔ ترکی ٹوپی پہننے کا حیدرآباد میں عام رواج تھا لیکن وہ پگڑی تحت الحنکی باندھتے تھے۔ لباس کی طرف سے بالکل بے پروا تھے۔ جس نے اپنے لیے علم کا جامہ قطع کر لیا ہو اسے آرائشِ جسم کی احتیاج کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اس کیفیتِ خاص کو انہی کی زبانی سنیئے۔

ہے گرچہ مرا لباس میلا — چرچا مرا پھر بھی خوب پھیلا
آرائشِ تن کے غم سے ہوں دور — آرائشِ جاں ہے مجھ کو منظور

از دولتِ علم سر فرازم — وز مال و منال بے نیازم

غذا بالکل سادہ استعمال کرتے تھے۔ میں نے انھیں سات آٹھ سال تک روزانہ نانِ جویں بھاجی ترکاری کے ساتھ کھاتے دیکھا اور مکان جس میں رہتے تھے وہ کرایہ کا تھا، نہایت سادہ کھپریل کا اور صرف ایک دالان اور ایک

کوٹھری پر مشتمل تھا۔ دالان میں ایک معمولی پلنگ اور چند چٹائیاں پڑی رہتی تھیں جن پر دن میں سب اٹھتے بیٹھتے تھے اور رات کو سو رہتے تھے۔ کرسی یا تخت وغیرہ قسم کی کوئی چیز میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ یہ تھی ایک سچے مسلمان کی زندگی کی سادگی۔ اسلام نے اس عالمِ فانی میں جس سادگی سے زندگی گزارنے کی تلقین کی ہے، منظور صاحب اس کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ان کے کسی عمل میں نمود و نمائش و زیبائش کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس ضمن میں صرف ایک واقعہ بیان کروں گا جو میرا خود چشمِ دید ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نواب تراب یار جنگ بہادر حیدرآباد کے بڑے جاگیردار ہونے کے علاوہ نواب سالار جنگ بہادر (یوسف علی رضوی) سے قرابتِ قریبہ بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور سعید تخلص کرتے تھے۔ وہ ۳ر شعبان المعظم کو بہ سلسلۂ ولادت باسعادت حضرت امام حسین علیہ السلام ایک جشنِ عالی ترتیب دیا کرتے تھے جس میں صرف شعرائے کرام ہی اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے تھے۔ نواب صاحب سیّد علی منظور کو مدعو کرنے کے لیے ان کے گھر واقع چنچل گوڑہ خود جاتے تھے۔ یہ تھی ایک امیر کی طرف سے ایک اہلِ علم کی قدردانی۔ ایسوں کے لیے ہی تو شیخ شیراز نے کہا ہے "تواضع زگردن فرازاں نکوست" اور منظور صاحب مرحوم، اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے، اسی ہیئت کذائی کے ساتھ جس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا گیا، قصیدہ خوانی کے لیے اس منبر پر جلوہ فرما ہوتے تھے جس کی آرایش و زیبایش سُرخ زردوز کپڑے سے کی جاتی تھی۔ ان کے ذاتی جوہر اور کردار و عمل کا یہ ایسا پختہ رنگ ہے جس کی چمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ ان کے روزمرّہ کے معمولات میں کتب بینی سب سے اہم کام تھا جس کے لیے وہ روزانہ کتب خانۂ آصفیہ ضرور جاتے تھے اور اس طرح اپنے ذوقِ کتب بینی کو گرم اور رواں دواں رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو ادب میں ان کا مطالعہ نہایت عمیق تھا۔ وہ شاعری کی ہر صنف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کا رنگِ تغزّل یہ ہے ؎

ناامیدی میں بھی رہ رہ کے خیال آتا ہے — اب بُلایا مجھے اس شوخ نے اب یاد کیا

ہے طرب آموز دل ذوقِ نگاہ — دیدنی مجھ کو ہر اک منظر ملا

چٹکیاں کون یہ رہ رہ کے لیے جاتا ہے — مرے دل میں تو مری جاں کوئی آیا نہ گیا
کب دکھاتا ہے وہ بربادیِ حسرت کا سماں — خاک میں جب مری حسرت کو ملایا نہ گیا
ان کی مشکوک نظر میں وہ مزا تھا منظور — کہ یقیں اپنی محبّت کا دلایا نہ گیا

پوچھو نہ کچھ ثبوتِ خرد میں نے کیا دیا — اک مستِ ناز کو دلِ بے مدّعا دیا
اب کیا گلہ کروں عدمِ التفات کا — میری نگاہِ یاس نے سب کچھ جتا دیا
انجامِ دید و عید اب اے ہم نشیں نہ پوچھ — وہ مجھ کو یاد ہے مجھے جس نے بھلا دیا
معلوم تھا تجھے کہ وہ درد آشنا نہیں — منظور دل کا درد انھیں بھی سُنا دیا

نظم کا انداز بھی ملاحظہ ہو ؎

میں ہوں بحرِ العلوم میں ہوں ہر سمت ہے جس کی دھوم میں ہوں
چرچا مرا کابل و عرب میں شہرت مری تونس و حلب میں
زینت دہِ مسندِ سلف ہوں روشن کنِ جادۂ خلف ہوں
اصحابِ خرد مرے ثنا خواں ارباب نظر ہیں مجھ پہ حیراں
مقصد مرا حق کی ترجمانی ہیں شارح وحیِ آسمانی
کلکِ قلم و ایں شبِ تار بس معنیِ خفتہ کرد بیدار

اور اس مخمس کا "طلسم مجاز" بھی دیکھیے ؎

یہی نگاہ یہی ساز باز رہنے دے انھیں حدوں میں مجھے سرفراز رہنے دے
بصیرتوں سے مجھے بے نیاز رہنے دے حقیقت اپنی بہ حدِّ مجاز رہنے دے
مری نگاہ کو نظّارہ باز رہنے دے
جو عشق و حُسن میں ہے امتیاز رہنے دے یہی مشاہدہ اے دل نواز رہنے دے
بڑھائے جا یونہی کیفِ نظر بڑھائے جا تو حلقہ ہائے نگاہِ ہوس پرست میں آ
تصوراتِ دلِ پاک باز رہنے دے
رہینِ حسرتِ راز و نیاز رہنے دے انھیں حدوں میں مجھے سرفراز رہنے دے
میں چاہتا ہوں اسی طرح سے رہوں ناکام متاعِ بلبل و پروانہ سے مجھے کیا کام
مرے لیے ہوسِ سوز و ساز رہنے دے
فروغِ آئینۂ دیدہ ساز رہنے دے "معاملہ" کی خموشی کو راز رہنے دے
خدا گواہ نہ تھا میں تو سائلِ دیدار بنا دیا تری شوخی نے مائلِ دیدار
مجھے قریبِ حریمِ مجاز رہنے دے

صنفِ شاعری میں تضمین ایک مشکل صنف ہے۔ حضرت نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ تضمین کی خوبی یہ ہے کہ وہ اصل شعر کے ساتھ مل کر ایک چیز ہو جائے۔ منظور صاحب مرحوم نے حضرت امیر مینائی کی ایک منقبتی نظم کی تضمین کی ہے اور وہ اس میں اس حد تک کامیاب ہوئے ہیں کہ گوشت اور ناخن کی مثال صادق آتی ہے۔ تضمین ملاحظہ ہو ؎

میں ہوں ملک النظم(۱) عیاں ہے مری توقیر دامن نہیں میرا دُرِ مقصود(۲) سے خالی
دنیائے ادب میں مرا آوازہ جہاں گیر ضو بخشِ جہاں ہے مرے چہرے کی بحالی
ممنونِ علیؑ ہوں نہیں منّت کشِ تدبیر ہے سارے زمانے سے مری شان نرالی
خامہ ہے مرا دستِ یداللہ کی شمشیر آئے جو تعلّی پہ مری ہمتِ عالی
کیوں کر نہ کروں ملکِ معانی کو میں تسخیر دشوار نہیں قلعۂ افلاک کی تسخیر

(۳)

اے مدّعیِ فضل گرا دے یہ پھریرا
ڈال اور کہیں فخرِ مباہات کا ڈیرا
کر غور اِدھر دیکھ، کدھر دھیان ہے تیرا
دل صاف، زباں صاف، سخن صاف ہے میرا
موتی کی لڑی ہے کہ مسلسل مری تقریر

(۴)

میں ہوں ہمہ داں مختلف انداز ہیں میرے
واقف نہیں سب ایسے اسالیبِ بیاں سے
قائل ہیں سخن رس ہی مرے لطفِ سخن سے
ہو صاحبِ معنی تو معانی مرے سمجھے
ہو صاحبِ توقیر تو جانے مری توقیر

منظور صاحب مرحوم کا ظاہر و باطن بالکل ایک تھا۔ ان کے کردار کی عظمت کا راز اس امر میں پوشیدہ تھا کہ نہ وہ کسی سے جلبِ منفعت کی خواہش رکھتے تھے اور نہ دولت و ثروت کی لالچ۔ وہ ایک معمولی سرکاری نوکری پر قانع تھے اور پوری زندگی توکل اور صبر و شکر کے ساتھ بسر کر دی۔ زمانے کا شکوہ کبھی ان کی زبان سے نہیں سنا۔ منظور صاحب کے حلقۂ احباب میں ایسے اشخاص بھی تھے جو کلکٹری اور کمشنری کے عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز تھے، ان میں سے بعض نے محترر اوراق کے سامنے ان سے کہا کہ وہ انھیں بہتر ملازمت دلوا دیں گے تاکہ ان کی مالی حالت اچھی ہو جائے لیکن منظور صاحب نے شدید اصرار کے باوجود منّت پذیر ہونا منظور نہیں کیا۔

یہ بات عموماً مشاہدے میں آئی ہے کہ آدمی توکل اور قناعت کی بات تو بہت کرتا ہے لیکن معاملاتِ دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہ پاتا اور توفیقِ عمل کا رشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ منظور صاحب میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود تھا۔ وہ کہتے کم تھے اور کرتے زیادہ تھے۔ انھوں نے اپنے قول کو عمل کے ساتھ اس قدر ہم آہنگ کر رکھا تھا جس کی مثال ملنی مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں۔

منظور صاحب نے ۱۹۵۵ء میں اس خارزارِ عالم سے اپنا دامن چھڑا لیا اور گلستانِ قدس کی جانب شاداں و فرحاں روانہ ہو گئے۔ وہ اللہ کے نیک بندے تھے اور اعمالِ صالح کے مہکتے ہوئے پھولوں سے ان کا دامن بھرا تھا۔ ایسے جاذبِ دروں کے لیے ہی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلَا خَوْفٌ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" — وہ اللہ کی بے شمار رحمتوں میں گھرے ہوئے جنّت الفردوس میں ہوں گے۔ وَاللّٰهُ وَهُوَ الْبَاقِيْ

چندن مترا

ہندوستان میں اردو کو درپیش مسائل

چند سال قبل لکھنؤ کی دیواروں پر ایک خاص قسم کے پوسٹر اور نعرے نظر آ رہے تھے۔ جن میں لکھا تھا کہ "جس بھاشا نے دیش کو تقسیم کیا ہے، اس بھاشا کو دیش سے نکال دو"۔ یہ پوسٹر اور نعرے جس پس منظر میں لکھے گئے تھے غالباً اس کی وضاحت ضروری نہیں ہے۔ دراصل ہندو احیا پرستوں کو اشتعال اس لیے آیا کہ اُتّر پردیش میں اردو کو صوبے کی دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ شدّت اختیار کر رہا تھا۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ نرائن دت تیواری نے بالآخر اردو کو اُتّر پردیش کی دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا قانون صوبائی اسمبلی سے منظور کروا ہی لیا جسے ان سے قبل ان کے متقدر پیش رو منظور کرنے سے گھبراتے تھے کیونکہ انھیں اس اقدام سے رونما ہونے والے شدید ردِّ عمل کا خدشہ تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے قبل اس قسم کے قانون کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے نتیجے میں شدید خون خرابہ رونما ہوا۔ اس کا اعلان ایسے وقت کیا گیا جب سارے معاملات کے بارے میں پہلے سے شک و شبہ موجود تھا۔

آج سے کئی عشرہ قبل اردو کو سارے ملک میں خصوصاً اُتّر پردیش میں (جو ہند اسلامی تہذیب کا گہوارہ ہے) جس ناگفتہ بہ صورتِ حال کا سامنا تھا۔ اس سے اسے بچانے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ہندی کے حامیوں نے (جس کی قیادت ابتدا میں رام منوہر لوہیا اور ان کا سوشلسٹ گروہ کر رہا تھا) اپنی مادری زبان کی ترقی کے لیے کچھ ایسا طریقۂ کار اختیار کیا جس سے دوسری تمام زبانوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ شمالی ہند میں بڑی اور مرکزی زبان کی حیثیت سے ہندی کا عروج لازمی تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب اردو کی قیمت پر کیوں رونما ہو؟ جیسا کہ سب جانتے ہیں، کسی زبان کا زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا اس وقت مشکل ہوتا ہے جب کہ اسے سرکاری سرپرستی حاصل نہ ہو۔ مزید یہ کہ اس اثنا میں انگریزی کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ (یہ دوسری بات ہے کہ اس کا معیار بہت زیادہ گر گیا ہے) ہر ریاست کو اس کا اختیار ہے کہ وہ مزید کسی زبان کو ترقی دینے کے لیے منتخب کرے۔ اردو کا المیہ یہ ہے کہ وہ سارے شمالی ہند میں پھیلی ہوئی ہے اور کوئی ایسی ریاست نہیں جہاں اردو داں اکثریت میں ہوں۔

اردو بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے اُتر پردیش کی بہ نسبت پنجاب میں صورتِ حال زیادہ واضح ہے غیر منقسم پنجاب میں زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگ بہت فراٹے سے اردو بولتے اور لکھتے تھے۔ پنجابی زبان کے سرکردہ ہندو، مسلمان اور سکھ مصنفین گھر پر اگرچہ پنجابی بولتے تھے لیکن اردو میں ہی باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ لیکن تقسیم کے چالیس سال بعد پنجاب (مشرقی پنجاب) میں اردو کا استعمال بہت کم ہو گیا ہے اور صرف پچاس فی صد لوگ اردو زبان لکھ یا پڑھ سکتے ہیں۔ پنجابی زبان و ادب اس وقت الفاظ کے معاملے میں مشکلات سے دوچار ہے۔

پنجاب میں اردو کی اس وقت جو صورتِ حال ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زبان کے نشو و نما پانے میں صدیاں لگتی ہیں اور اس زبان کے مرجھانے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ یہ کام ایک عشرے میں مکمل ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اسے حکومت کی سرپرستی حاصل نہ ہو۔

بہرحال! اردو خود کو سنبھالا دینے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ خواہ یہ تحلی سطح پر ہی خود کو نمایاں کرنے میں کامیاب کیوں نہ ہو۔ تقسیم ملک کے بعد کی ہندوؤں کی نسل۔ خصوصاً اُتر پردیش کی نئی ہندو پیڑھی نے اردو کو جذباتی طور پر مسترد نہیں کیا ہے۔ محض انتقام کے طور پر کیا ہے۔ اردو آج بھی وہاں کی زمین سے وابستہ طبقۂ اشرافیہ اور علمائے کرام سے گہرے طور پر ہم رشتہ ہے۔

تقسیم سے قبل اردو کے خلاف جو لہر اٹھی اس کی وجہ ہندی کی احیا تحریک کا زمانۂ عروج تھا جس میں نہ صرف برطانوی حکومت مزاحم تھی بلکہ اس میں زیریں سطح فرقہ واریت بھی چھپی ہوئی تھی۔ اُتر پردیش کے ممتاز ہندی داں، خصوصاً وسطی اور مغربی حصّے کے ہندی بولنے والے، اردو داں مسلم شرفا کی سماجی حیثیت کے مساوی نہ ہونے کے باعث حسد اور جلن محسوس کرتے ہیں۔ عددی اکثریت سے قطع نظر ہندی بولنے والے ممتاز ہندوؤں کو اپنے مدِمقابل مسلمانوں کی بہ نسبت اپنی ثقافتی کمتری کا شدّت کے ساتھ احساس تھا، خصوصاً مسلمانوں میں جو سماجی شان و شوکت پائی جاتی تھی اس سے وہ محروم تھے۔

اُتر پردیش کے مسلمانوں کا طبقۂ اشرافیہ چونکہ تحریکِ پاکستان میں پیش پیش تھا اس لیے ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے میں ان کے خلاف زبردست اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔ اُتر پردیش میں مسلم لیگ نے بہت بعد میں اپنی جڑیں مضبوط کیں ۱۹۳۰ء کے اوائل تک مسلم لیگ کی قیادت نواب چھتاری، راجہ سلیم پور اور نواب رام پور جیسے جاگیردار کر رہے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے بعد جو سیاسی طوفان آیا اس نے مسلمانوں کے طبقۂ اشرافیہ کو نہایت تیزی کے ساتھ ایک صف میں کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا۔

ہندو اشرافیہ میں اندر سے جو نفرت پائی جاتی ہے اسے سمجھنے کے لیے گہرائیوں میں اتر کر اس کے تاریخی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس نفرت میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب رام منوہر لوہیا نے ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ہندی کی حمایت میں تحریک شروع کی۔ یہ تحریک اگرچہ انگریزی کے خلاف تھی لیکن سنسکرت آمیز ہندی کی جارحانہ ترویج نے اردو کو مزید نقصان پہنچایا۔ ہندوستانی زبان کو سنسکرت آمیز بنانے کے عمل سے اردو پر مضرت رساں اثرات مرتّب ہوئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حکومت نے اس احیا پرستانہ رجحان کی کھُل کر حوصلہ افزائی کی جس سے اردو کو زبردست نقصان پہنچا۔ اس میں شبہ نہیں کہ تقسیمِ ملک کے بعد کسی بھی انتظامیہ کے لیے ہندی کے بارے میں عوام کے

جوش وخروش کو نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ حکومت کو یقین تھا کہ اگر ہندی کو سنسکرت آمیز بنا دیا جائے (جس کا ہندی داں حلقے کو ادراک نہیں تھا) تو لوگوں میں اردو سے دلچسپی رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ نوجوانوں کے لیے (جن میں مسلمان نوجوان بھی شامل ہیں) آج اردو ایک بھرپور زبان ہے۔

شمالی ہند کی حکومت نے رفتہ رفتہ اپنی زبانوں اور ثقافتوں کو نہایت سرگرمی کے ساتھ اردو کے اثرات سے پاک کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ اردو کی پُرزور وکالت کرنے لگا۔ مفاد پرستوں کا ایک طبقہ پیدا ہو جانے کے باعث اردو کا مزید انحطاط ہوا اور بعض نہایت پُرخوش جذباتی مسلمانوں نے اردو زبان پر فرقہ واریت کی مہر ثبت کر دی جو تباہ کن ثابت ہوا۔

لکھنؤ، جو ہند اسلامی تہذیب کی بہترین روایات کا منبع اور گہوارہ ہے آج مکمل طور پر ہندی زدہ ہے۔ مسلمانوں کے محلّے امین آباد کے گھروں میں مشکل سے کہیں اردو سنائی دیتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر جدید ہندوستان کے حکمرانوں نے نہ صرف مسلمانوں کو باڑے میں گھیر رکھا ہے، بلکہ سازش کے تحت زبان کو بھی اس کی ثقافت کے ساتھ قید کر دیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مسلمان، جنھیں ہر معاملے میں اپنی محرومی کا احساس رہتا ہے، کیا یہ شدّت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ اردو کا مستقبل محفوظ ہے؟ گو کہ یہ بات بہ ظاہر مہمل نظر آتی ہے، لیکن اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ اردو کے سلسلے میں مسلمانوں سے جو وعدے وعید کیے گئے ہیں وہ قطعی غیر مقید ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاست دانوں نے اردو کو ریاست میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دے کر اسے سیاسی سکّہ رائج الوقت کے طور پر استعمال کیا ہے اور یہ سب کچھ عام انتخابات کو پیشِ نظر رکھ کر کیا گیا ہے، لیکن یہاں ہم بڑے مسائل سے دوچار ہیں۔ اگر حکومت اردو کی ترویج کے لیے کچھ نہیں کرتی ہے تو اس پر الزام ہوتا ہے کہ اس نے اردو کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اگر اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دی جاتی ہے تو کہا جائے گا کہ یہ محض دکھاوا ہے اور اس کا مقصد فرقہ واریت کی پردہ پوشی ہے۔ بہرحال ہمیں ان کوتاہیوں سے نکل کر سنجیدگی کے ساتھ اور سیاست اور انتخابات سے بلند ہو کر اردو کے مستقبل کے بارے میں غور وخوض کرنا چاہیے۔

اردو کو صرف دوسری سرکاری زبان بنانے کے سرکاری فیصلے سے اردو کے سچّے بہی خواہوں کو خوشی نہیں ہوگی۔ البتّہ اس سے مسلمانوں کے جاہ طلب طبقے کو مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جانب اس سے ہندو فرقہ پرستوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ اس تناظر میں بدایوں کے فسادات سے حد سے زیادہ اثر قبول کرنا بے معنی ہے۔ اگرچہ یہ واقعہ بہت المناک ہے۔

دونوں فرقوں کے احیا پرست مختلف سیاسی جماعتوں میں جس طرح دلّالی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف شمشیر زنی پر مائل کر دیا ہے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر اگر ہم بہتر معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا رویّہ اور اپنی معاشرتی نفسیات بدلنی ہوگی۔ زبان کو مذہب کی وجہ سے رسوا نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ تاریخ کی متعصبانہ تعبیر کے ذریعے کلچر کو کچلا جا سکتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اردو کو اُتّر پردیش کی دوسری سرکاری زبان قرار دینے پر کم از کم اس وقت نرائن دت تیواری کو تعریف وتحسین کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لوگوں کو آپس میں تقسیم کرنے والے اس اقدام سے صرف فرقہ وارانہ کشیدگی

بیں اضافہ ہوگا اقتدار پرستوں کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

اردو کے مسائل کا حل اس قسم کے نمائشی اقدامات کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ خواہ اس اقدام کے نتیجے میں کانگریس کو مسلمانوں کا ووٹ کیوں نہ حاصل ہوجائے۔ اس کا حل صرف ہندوستانی زبان کے نئے جنم میں پوشیدہ ہے۔ نہ صرف مسلمان اردو کی حفاظت کرسکتے ہیں اور نہ تنہا اسے ترقی دے سکتے ہیں۔ اردو ہندوستانی ثقافت کا بہترین ورثہ ہے۔ اگر ہندوؤں نے اردو کے سلسلے میں اپنے تعصب کو ترک نہیں کیا تو وہ آگے چل کر نقصان میں رہیں گے۔ جیسا کہ ہماری تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ بہت کم ہندو ایسے ہیں جن میں تاریخ کا شعور پایا جاتا ہے۔

حرفِ چند

از

جمیل الدّین عالی

قیمت: سَو روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

مکتوبِ حجاز

پچھلے دنوں جدّہ میں مقیم ممتاز دینی، علمی اور ادبی ہستی پروفیسر واصل عثمانی کا تبادلہ تمام ہوا تو اس موقع پر معروف ادبی شخصیت جناب تسلیم الٰہی زلفی نے اپنے دولت کدے پر عثمانی صاحب کے اعزاز میں ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں جدّہ، مکتہ المکرمہ، الطائف اور قصیم کے مقتدر و معروف اہلِ علم و دانش اور با ذوق معززینِ شہر کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔

اس محفلِ مشاعرہ کی صدارت مقتدر دینی و علمی اسکالر مولانا محمد یامین عثمانی صاحب نے فرمائی۔ مہمانِ خصوصی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے میزبان تسلیم الٰہی زلفی نے پروگرام کے آغاز میں کہا کہ پروفیسر واصل عثمانی، اکبر الہ آبادی کے استاد وحید الہ آبادی صاحب کے پرپوتے ہیں اور فراق گورکھپوری کے منظورِ نظر شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

آپ ۱۹۷۸ء سے یہاں الیمونیم پروڈکٹ کمپنی میں چیف اکاؤنٹینٹ کے عہدے پر مامور ہیں۔ زلفی صاحب نے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا کہ پروفیسر واصل عثمانی نے کئی نثری کتب تخلیق کی ہیں جن میں "سخن ورانِ قصبہ کڑا" ۱۹۶۴ء "ماں قرآن و سنت کی روشنی میں" ۱۹۷۶ء، مولانا شبلی نعمانی پر تین کتب "شبلی ادیبوں کی نظر میں"۔ "شبلی نقادوں کی نظر میں" اور "شبلی بلادِ اسلامیہ میں"، چار کتب "اکاؤنٹس پرابلمس" پر اس کے علاوہ "فسانۂ عجائب" کو بھی آپ نے ایڈٹ کیا ہے۔ ان مقتدر کتب کے علاوہ درجنوں رسائل، تنقیدی و اصلاحی اور تاثراتی مضامین نیز شعری کاوشیں برِصغیر پاک و ہند کے ممتاز دینی، علمی اور ادبی مجلّات و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مہمانِ خصوصی کے حوالے سے میزبان کی تعارفی گفتگو کے بعد مشاعرے کا آغاز ناظمِ مشاعرہ ناظر قدوائی نے اپنے کلام سے کیا۔ ان کے بعد میزبان شاعر تسلیم الٰہی زلفی نے اپنا کلام سُنایا۔ ان کے علاوہ مولانا یامین عثمانی، پروفیسر واصل عثمانی، احمد جمال صادق، سجّاد بابر، نسیم سحر، یاد صدیقی، اطہر عباسی، ظفر مہدی، طارق سعید، عبدالباری انجم، شبیہہ الحسن حسنین، حیات النبی رضوی، مرزا یوسف زہیر، نجم الحسن ضمیر اور حسن محمود۔ اس طرح رات ساڑھے گیارہ بجے شروع ہونے والی یہ محفل صبح ساڑھے تین بجے پُرتکلّف چائے کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچی۔

تسلیم الٰہی زلفی (میزبان)

یہ کیا، کہ سبھی سے ہیں ترے خاص مراسم! کچھ اپنے پرائے کی بھی پہچان رکھا کر

مولانا یاسین عثمانی (صدرِ محفل)

ظاہر نئی بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں — وحشی کچھ اور داخلِ زنداں ہوئے تو ہیں

پروفیسر واصل عثمانی (مہمانِ خصوصی)

عہدِ نا پرساں میں ہمارے جسم و جاں کی قیمت کیا — قریہ قریہ ہم کو بانٹا گویا ہم خیرات ہوئے

احمد جمال صادق

خرد کی حکمرانی حلقۂ کون و مکاں تک ہے — کمندِ عشق کی زد میں مکاں سے لامکاں تک ہے

سجاد بابر

سوچ پرواز تو کرتی ہے شب و روز مگر — ٹوٹ کر صحن میں گرتی ہیں اُڑانیں ساری

نسیم سحر

اپنے بدن میں رہنا ہے — کیسے بن میں رہنا ہے

ظفر مہدی

تبصرہ غیر کے کردار پہ کرنے والے — کیا تری خود سے ملاقات نہیں ہوتی ہے

ماہ صدیقی

شاخوں نے خود ملا دیے مٹی میں اپنے پھل — یہ سانحہ مگر کہیں تحریر بھی نہیں

اطہر عباسی

ان آنکھوں کا تلاطم کہہ رہا ہے — کہ اس دل میں سمندر بہہ رہا ہے

طارق سعید

فطرت اس کی اسے کس شہ کی طلب گار کرے — آگہی خود کو اگر معتکفِ غار کرے

عبدالباری انجم

سب ہی رفیق مجھے مفلسی میں چھوڑ گئے — بس ایک پیرہنِ تار تار باقی ہے

حیات النبی رضوی

بھلائیں لاکھ، کہیں وہ بھلائے جاتے ہیں — غزل میں جانِ غزل بن کے آئے جاتے ہیں

شبیہہ الحسن حسنین

جو خلش اِدھر ہے دل میں، یہ خلش اُدھر نہیں ہے — مرے عشق کا فسانہ ابھی رنگ پر نہیں ہے

مرزا یوسف رہبر

آتشِ غم تیز رکھو دل کے اوجِ طور پر — کون جانے کب کسی کا پھر پیام آنے لگے

گل ہائے رنگ رنگ
بنگلہ کہانی

رامانا تھ رائے / یاور امان

گھر اور خاندان

میری بیوی کا نام اُلکا ہے اور میرا نام تریندر۔ ہم لوگ ۱۷۔ بی سرانند روڈ کے دو منزلے پہ بائیں طرف کے فلیٹ میں رہتے ہیں۔ ہم لوگوں کے فلیٹ میں ایک ڈرائنگ روم، دو بیڈ روم اور ایک ڈائننگ روم ہے۔ اس فلیٹ میں ہم دونوں کے علاوہ ایک بیوہ عورت بھی رہتی ہے۔ جو کھانا پکانے، برتن مانجھنے اور کپڑے دھونے کا کام کرتی ہے۔ اُلکا صرف بستر پہ چادر بچھاتی ہے اور آلنے پہ سوکھے ہوئے کپڑے تہ کر کے رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنے بال سنوارتی اور ریڈیو سنتی ہے۔ میں دفتر کے لیے صبح نکل پڑتا ہوں اور شام کو لوٹتا ہوں۔ میں اُلکا سے پیار کرتا ہوں، وہ بھی مجھ سے پیار کرتی ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں ایک ہی بستر پہ ایک ساتھ ہی سوتے ہیں۔ ہمارے سر پہ ایک پنکھا چلتا رہتا ہے۔ ہم لوگ اکثر گاہے گاہے گھومنے نکل جاتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں۔ دعوت کھاتے ہیں۔ سارا وقت ہم لوگ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ کبھی بیٹھ کر تو کبھی لیٹ کر۔ ہم لوگوں کی باتیں ختم ہی نہیں ہوتیں۔

اسی طرح ہمارے چار برس گزر گئے۔ پھر رفتہ رفتہ ایک وقت ایسا آیا جب میں اُکتا گیا۔ اُلکا بھی اُکتا گئی۔ ہم لوگوں کے سیر سپاٹے کم ہو گئے اور بول چال بھی کم ہو گئی۔ مزاج میں چڑچڑاپن شامل ہو گیا۔ اُلکا بھی چڑچڑی ہو گئی۔ اُلکا سے میری لڑائی ہونے لگی۔ اُلکا بھی مجھ سے جھگڑنے لگی۔ اس کے باوجود ہم دونوں ایک ہی فلیٹ کے ایک ہی کمرے کے ایک ہی بستر پہ الگ الگ سوتے رہے۔

اس طرح مزید دو سال گزر جانے پر میرا بیٹا پیدا ہوا۔ میں نے فوراً اُلکا کو معاف کر دیا۔ اُلکا نے بھی مجھے معاف کر دیا۔ اپنے لڑکے کو میں پیار سے بابو کہہ کر پکارنے لگا۔ بابو پھلوں کا رس اور دودھ پی کر، وٹامن کھا کر بڑا ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ اس نے کروٹ لینا، گھٹنوں کے بل چلنا، کھڑا ہونا، دوڑنا اور باتیں کرنا سیکھا۔ میں بابو کو لے کر ٹہلنے نکلتا۔ اب بابو ہی میری اور اُلکا کی باتوں کا موضوع تھا۔ بابو ہمارے آس پاس گھومتا پھرتا۔ میں روز بابو کے لیے نئے کپڑے لے آتا۔ کھلونے لاتا۔ بابو کے مستقبل کا خیال کر کے میں ہر مہینے بینک میں روپیہ جمع کرنے لگا۔ اس کا لائف انشورنس کروایا۔ دھیرے دھیرے بابو مجھ سے پڑھنے لگا۔ حساب سیکھنے لگا۔ میں نے بابو کو ایک اچھے اسکول میں داخل کر دیا اور بابو معمول کے مطابق اسکول جانے لگا۔ میں ہر وقت بابو کے بارے میں ہی سوچتا۔ رات میں اُلکا کے ساتھ بستر پہ لیٹے لیٹے بابو کا ہی ذکر ہوتا۔ بابو

ہم دونوں کے بیچ میں سوتا۔ سوتے وقت میں بآبو کی طرف کروٹ بدل لیتا۔ اُلکا بھی ایسا ہی کرتی۔ بآبو کا ایک پاؤں مجھ پر ہوتا اور دوسرا اُلکا پر۔ ہمارے سر کے اوپر پنکھا چلتا رہتا۔ اس کی ہوا ہم تینوں کو لگتی۔

اسی طرح ہمارے دن، مہینے اور سال گزرنے لگے۔ بآبو ہماری نظروں کے سامنے بڑا ہونے لگا۔ ایک دن بآبو اتنا بڑا ہو گیا کہ اسے اپنے ساتھ سُلانا مشکل ہو گیا۔ تب اُلکا اور بآبو دوسرے کمرے میں جا کر سونے لگے۔ شروع میں مجھے اکیلے نیند نہیں آتی تھی۔ بڑی تکلیف ہوتی تھی اس لیے میں وقفے وقفے سے بابو کے کمرے میں چلا جاتا۔ بآبو کے سر پر اور اس کے جسم پر میں ہاتھ پھیر کر چلا آتا، لیکن بآبو اس سے بے خبر رہتا۔

بآبو پڑھائی لکھائی میں اچھا تھا۔ اس کے امتحان کا نتیجہ بھی اچھا ہوتا۔ میں اپنے ہر ملنے جلنے والے سے بآبو کا ذکر کرتا۔ اسے تفصیل سے بتاتا کہ بابو کتنے بجے پڑھنے بیٹھتا ہے۔ کتنے گھنٹے پڑھتا ہے اور کس طرح پڑھتا ہے۔ اس کے ساتھ انھیں یہ بھی بتاتا کہ اس کے اسکول کے کس ٹیچر کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ جنھیں یہ بتاتا انھیں شاید یہ سب سُننا اچھا نہیں لگتا، لیکن مجھے یہ سب بتانا اچھا لگتا تھا۔ میں اپنی باتیں جاری رکھتا۔

بآبو نے اسکول کی پڑھائی اچھے نمبروں سے پاس کی اور کالج میں داخل ہوا۔ بآبو اب سگریٹ پینے، پان کھانے اور کیو میں لگ کر سنیما دیکھنے لگا تھا۔ وہ اب بڑا ہو گیا تھا۔ بآبو کو اب الگ کمرے کی ضرورت تھی۔ اُلکا پھر سے میرے کمرے میرے بستر پر لوٹ آئی۔ ہم لوگ ایک بار پھر ایک ساتھ سونے لگے۔ مگر اب ہم لوگ پہلے کی طرح بآبو کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ مجھے لیٹتے ہی نیند آجاتی تھی اور الکا کا بھی یہی حال تھا۔

اب بآبو کی عادتیں بدلنے لگی تھیں۔ اس کے کپڑے مختلف طرح کے ہونے لگے۔ اپنے بالوں کی طرف وہ زیادہ دھیان دینے لگا۔ بات کرنے کا اسٹائل بدل گیا۔ وہ رات کو دیر سے گھر آنے لگا۔ کبھی کبھی اس کے منھ سے شراب کی بُو آتی۔ میں نے ایک دن برداشت کیا، دو دن برداشت کیا۔ آخر کار ایک دن بآبو کو بہت ڈانٹا لیکن اس سے کوئی بات نہیں بنی۔ ہر دن میرا غصہ بڑھنے لگا۔ اب وہ بھی مجھ سے تکرار کرنے لگا۔ غلط طریقے سے جواب دینے لگا۔ میں نے بآبو سے بولنا بند کر دیا اور میرا سارا غصہ اُلکا پر مرکوز ہو گیا۔ اُلکا کے لاڈ پیار نے ہی بآبو کو بگاڑا تھا۔ بابو کی وجہ سے صبح و شام اُلکا سے میری لڑائی ہونے لگی۔ اُلکا بآبو ہی کی طرف داری کرتی۔ آخر کار اس نے ایک دن ڈرائنگ روم میں اپنے سونے کا بندوبست کر لیا۔ ہم تین شخص تین الگ الگ کمروں میں سونے لگے۔ اُلکا سے بھی میری بات چیت بند ہو گئی۔

بآبو نے ایک دن کالج کی پڑھائی بھی پوری کر لی۔ اب بابو کی طرف سے میرا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ بآبو نوکری کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اخباروں میں اشتہار دیکھ کر وہ مختلف جگہوں پر درخواستیں بھیجنے لگا۔ دو سال کے بعد بآبو کو ایک اچھی تنخواہ والی نوکری مل گئی۔ نوکری مل جانے کے بعد بھی بابو کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہر مہینے وہ مجھے تھوڑے سے روپے دے دیتا۔ باقی روپے کیا ہوتے مجھے کچھ پتا نہیں چلتا۔ میں اس سلسلے میں اس سے کچھ پوچھتا بھی نہیں تھا۔

بآبو ہر روز رات کو دیر سے گھر لوٹنے لگا۔ اس کے منھ سے شراب کی بُو آنے لگی۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی اس سے میری جھڑپ ہو جاتی تھی۔ بالآخر میں مایوس ہو گیا۔ لوگوں نے بابو کی شادی کر دینے کا مشورہ دیا۔ بآبو سے اس کا ذکر کر

کرتے ہی وہ تن گیا۔ اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ اُلکا نے بابو کو بہت سمجھایا۔ لیکن بابو کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کی وجہ آخر ایک دن میری سمجھ میں آگئی۔ بابو پہلے ہی شادی کر چکا تھا۔ یہ سُن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ جی چاہا بابو کو گھر سے نکال دوں۔ ایسے لڑکے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی، لیکن میں تلملاتا ہی رہ گیا۔ اُلکا، بیٹے کی وکالت کرنے لگی اور مجھے کچھ کرتے نہیں بنا۔ آخر مجھے ہی سمجھوتہ کرنا پڑا۔ اس کی بیوی کو گھر میں جگہ دینی پڑی۔ بہو دیکھنے میں بُری نہیں تھی مگر اس کا چال چلن مجھے پسند نہیں آیا۔ اُلکا کو بھی پسند نہیں تھا۔ چند مہینوں کے بعد ہی بہو کے ساتھ اُلکا کی تکرار ہونے لگی۔ گھر کا ماحول بگڑ گیا۔ پھر بابو نے ایک دن اپنی بیوی کے ساتھ میرا گھر چھوڑ دیا — بابو پھر گھر نہیں لوٹا۔ نزدیک ہی کسی کرائے کے مکان میں رہنے لگا۔ اُلکا میرے کمرے میں واپس لوٹ آئی۔ ہم لوگ پھر ساتھ سونے لگے۔ ہمارے سر پہ پنکھا فُل اسپیڈ سے گھومتا رہتا۔ پھر بھی ہمیں نیند نہیں آتی تھی۔ اُلکا اکثر رونے لگتی۔ مجھے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ میں سمجھ نہیں پاتا تھا کہ کیا کروں۔ اس طرح بہت دن بیت گئے۔ بابو ایک بار بھی ہم سے ملنے نہیں آیا۔

میں پھر سے اپنے شب و روز میں لوٹ آیا۔ صبح دفتر جانے اور شام کو گھر لوٹنے لگا۔ مگر اُلکا کو لے کر باہر نکلنا بند ہو گیا۔ اُلکا چپ چاپ وراندے میں بیٹھی رہتی تھی۔ میں بھی اسی طرح خاموش بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھار دو ایک باتیں ہو جاتیں مگر بابو کے بارے میں ہم لوگ کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ صرف ایک دن اُلکا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بابو سے ملنے کا میرا ارادہ ہے کہ نہیں؟ میرے انکار کر دینے کے بعد اُلکا نے پھر کبھی اس موضوع کو نہیں چھیڑا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا، شاید میرا اس طرح انکار کر دینا کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ بابو کو دیکھے بہت دن ہو گئے تھے۔ پتا نہیں بابو کیسا ہے؟ اگر اُلکا وہاں جاتی تو بابو کی خیریت مل جاتی۔

ایک دن شام کو گھر لوٹنے پر اُلکا کو بہت خوش دیکھا۔ اس کے چہرے پہ پہلی جیسی اداسی نہیں تھی۔ آخر بات کیا تھی؟ کیا بابو گھر آیا تھا؟ یہ سوال پوچھنے پر اُلکا پہلے تو ٹال گئی۔ پھر بغیر بتائے رہ بھی نہیں سکی۔ آج اچانک راستے میں بابو سے اُلکا کی ملاقات ہو گئی تھی۔ یہ سنتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا۔ "بابو ٹھیک تو ہے؟" "ہاں! بابو راضی خوشی ہے۔ اس کی بیوی بھی خوش ہے۔" اُلکا نے بابو سے گھر آنے کے لیے کہا ہے۔ بابو آئے گا۔ جلد ہی آئے گا۔ بابو نے بھی اُلکا کو اپنے گھر میں بلایا ہے۔ مجھ سے بھی آنے کے لیے کہا ہے، لیکن میں نہیں جاؤں گا قطعی نہیں۔

ایک ہفتے کے بعد بابو آیا۔ ساتھ میں اس کی بیوی بھی تھی۔ اس نے ہم لوگوں کے پیر چھوئے۔ میں اندر ہی اندر بے چین ہو گیا۔ اُلکا، بہو اور بابو وراندے میں باتیں کرنے لگے۔ میں اپنے کمرے میں ایک کتاب لے کر پڑھنے لگا، لیکن مجھ سے ایک صفحہ بھی نہیں پڑھا گیا۔ میں رہ رہ کر کن انکھیوں سے بابو کو دیکھ لیتا تھا۔ میرے کان بابو کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ بابو اب لائق بن گیا تھا۔ اس کی قمیض اس پر بہت پھب رہی تھی۔ اس کی مونچھیں بھی قرینے سے ستواری ہوئی تھیں۔ اس کے بولنے کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے مزا آیا۔ تھوڑی دیر بعد بابو اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے ایک بار پھر ہمارے پیر چھوئے۔ اُلکا نے بابو سے دوبارہ آنے کے لیے کہا۔ بابو نے بھی ہمیں اپنے یہاں بلایا اور ہم لوگوں نے آنے کا وعدہ بھی کر لیا، لیکن بابو کی طرف سے میرا غصہ کم نہیں ہوا۔ بابو کے اس طرح الگ رہنے کی بات

مجھے اچھی نہیں لگی تھی۔ میں اس کے یہاں نہیں گیا۔ مانا کہ بابو کی اپنی بیوی کے سلسلے میں کوئی ذمہ داری تھی۔ وہ الگ رہنے کا انتظام کر سکتا تھا لیکن کیا ہمارے سلسلے میں اس کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی؟ ہم لوگ بوڑھے ہو چلے تھے۔ ہم لوگوں سے غلطی ہو سکتی تھی، لیکن بابو کی عمر ابھی کم تھی۔ اس سے بھلا کیوں بھول ہو گئی؟ بابو کو ہم لوگوں سے تعلقات رکھنے میں بھلا کیا دشواری تھی؟ الکا، بابو سے ملنے اس کے لیے گھر جانا چاہیے، جائے۔ میں نہیں جاؤں گا۔

الکا اکثر بابو کے یہاں جاتی۔ بابو بھی کبھی کبھی چلا آتا، بہو بھی آتی رہتی۔ وہ مجھے ہر بار اپنے یہاں بلا جاتے۔ ایک دن الکا اسی بات پر مجھ سے ناراض ہو گئی۔ اس کے باوجود میں وہاں نہیں گیا۔ میں نے کہا۔ "پوتا ہوتے پر جاؤں گا اس سے پہلے نہیں۔" تین ہی مہینے کے بعد خبر ملی کہ میں دادا بننے والا ہوں۔ الکا ہی سے یہ بات مجھے معلوم ہوئی جسے سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ساتھ ہی دکھ بھی ہوا۔ اس رات نیند نہ آئی۔

بہو کو اس وقت دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر سے باقاعدہ صحت و تندرستی کے معائنے کی ضرورت تھی۔ اب کسی کو ہر وقت اس کے پاس رہنا چاہیے۔ الکا کچھ دنوں کے لیے وہاں چلی گئی۔ پھر کچھ مہینے بعد اپنے میکے چلی گئی۔ بابو اکیلا رہنے لگا۔ اس کے باوجود وہ ہمارے ساتھ رہنے نہیں آیا۔ تب الکا ہی وہاں جا کر اس کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ اس عرصے میں ایک بار بھی الکا کو میرا خیال نہ آیا اور میں تنہا ہی دن گزارنے لگا۔

ایک دن الکا نے اسپتال سے تقریباً دوڑتے ہوئے آ کر مجھے پوتے کی پیدائش کی خوش خبری سنائی۔ میں نے اسپتال جا کر پوتے کو منھ دکھائی میں ایک اشرفی دی۔ وہ دیکھنے میں بڑا خوبصورت تھا۔ اس کے سر پر ڈھیر سارے بال تھے اور اس کی ناک بڑی تیکھی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ گھر واپس آ کر میں کافی دیر تک اکیلے ورانڈے میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا بیٹھا رہا۔

دوسرے دن بہو اسپتال سے گھر لوٹ آئی۔ اس بار میں وہاں گئے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں روز بابو کے یہاں جانے لگا۔ الکا وہیں رہنے لگی۔ وہاں وہ روز منّے کو تیل لگاتی، اسے نہلاتی اور بڑے پیار سے وہ اسے منّا منّا کہہ کر پکارتی۔

چھ مہینے کے بعد منّے کی نمک چاشنی ہوئی۔ اس نے رفتہ رفتہ اُلٹنا سیکھا، گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا، کھڑا ہونا اور چلنا سیکھا، دوڑنا سیکھا، ساتھ ہی باتیں کرنا بھی سیکھا۔ میں روز منّے کو چہل قدمی کے لیے لے جاتا۔

تین سال بعد میں ریٹائر ہو گیا۔ چاروں طرف بڑا سُونا پن محسوس ہونے لگا۔ اب جیسے میرے کرنے کے لیے کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ منّا بابو کے پاس رہتا تھا۔ میں بابو کو سمجھا بجھا کر منّے کو اپنے پاس لے آیا۔ اب منّا میرے پاس رہنے لگا۔ بابو اور بہو بھی اکثر آتے جاتے۔ خوب گہما گہمی رہتی۔

میں نے منّے کو اسکول میں داخل کروا دیا۔ الکا منّے کو روز اسکول پہنچانے اور لینے جاتی تھی۔ میں پارک میں منّے کو تفریح کرانے لے جاتا۔ راستے میں جو بھی ملتا اس سے باتیں کرتا۔ منّے کی باتیں۔ میں پارک میں جا کر ایک بنچ پر بیٹھ جاتا۔ اور منّا میرے سامنے کھیلتا کودتا رہتا۔ شام ڈھل جانے پر ہم دونوں گھر لوٹ آتے۔ میں اپنی داہنی ہتھیلی سے منّے کی بائیں ہتھیلی پکڑے رہتا۔ گھر لوٹ کر منّا پڑھنے بیٹھ جاتا۔ پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہم لوگ کھا پی کر سو جاتے۔ منّا ہم دونوں کے بیچ میں

سوتا۔ منّے کی بائیں ٹانگ میرے اوپر ہوتی اور داہنی اُلٹا پہ۔ اور سر پر فُل اسپیڈ سے پنکھا گھومتا اور اس کی بھُر بھُری ہوا ہم لوگوں کو لگتی رہتی۔ اس طرح باتیں کرتے کرتے نہ جانے کب سو جاتے۔ منّا کو اپنے والد کے بچپن کی باتیں سننے میں بڑا مزا آتا۔ ہم اسے وہی سناتے جسے سنتے سنتے منّا ہنسنے لگتا۔ بابو کا ذکر کرتے کرتے کبھی کبھی میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

ایک دن شام کو بابو ہماری مرضی کے بغیر منّے کو لے گیا۔ ہم لوگوں نے اسے بہت سمجھایا مگر بابو نے کسی کی نہیں سُنی۔ ہم کافی دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہے اور اس کے بعد چُپ چاپ لیٹ گئے۔ ہمارے درمیان کہنے کو اب کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ سب ختم ہو گیا تھا۔ صرف سر پہ پنکھا پوری رفتار سے گھوم رہا تھا۔

دیوانِ غالب کامل

غالب شناسی کی ایک نئی مشعل

کلامِ غالب مستند تاریخی ترتیب کے ساتھ

مرتّب کی خصوصی اجازت اور بعض نئی تصحیحات کے ساتھ

طبع ہو رہا ہے

انجمن ترقیِ اُردو پاکستان بابائے اُردو روڈ، کراچی ۱

غالبِ آشفتہ نوا

مصنّف

ڈاکٹر آفتاب احمد

قیمت ——— ۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

گل ہائے رنگ رنگ

بنگلہ نظم

رابندر ناتھ ٹیگور/جاوید دانش (کنیڈا)

آبشار

آج کی صبح درخشاں
یہ شعاعِ آفتاب
زندگی پر کیا اثر انداز ہے
جانے کیوں اتنے دلوں کے بعد جاگی زندگی
جاگ اٹھی ہے زندگی
رقص میں ہے موجِ آب
آرزوئے زیست قابو میں نہیں
جذبۂ رفتار قابو میں نہیں
لرزہ براندام ہے کیوں کوہسار
سنگ ریزے گر رہے ہیں بار بار
جم رہا ہے کفِ سمندر پر تمام
شدتِ غیض و غضب میں گونج اٹھا دیوانہ وار
عالمِ مستی میں پیہم مضطرب امواج ہیں
بھاگ جانا چاہتا ہے
پر درِ زنداں نظر آتا نہیں
یہ مقدر جیسے پتھر
بند ہے، چاروں طرف سے بند ہے
اے مرے دل توڑ دے
توڑ دے تُو، بندشوں کو توڑ دے!
سرکشی ہے موج موج
بول اٹھا ہے زخم زخم
زندگی جب ہو گئی ہے مست تو
کیا اندھیرا کیا اجالا کا وٹ؟
سیلِ رحمت کھینچ دوں گا
سنگِ زنداں توڑ دوں گا
عالمِ کیف و طرب میں نغمہ زن ہو جاؤں گا
زلفِ سرکش
گل بداماں ——
نقش ہے قوسِ قزح کا جیسے اک شہپر حسیں
میں تبسم ڈال کر ان آفتابی کرتوں میں
پھونک دوں گا ان میں جان!
اِس سرِ کہسار سے
اُس سرِ کہسار تک
پربتوں سے پربتوں تک سر بہ سجدہ جاؤں گا
قہقہوں میں قہقہہ
زیر و بم کے پیچ و خم پر سر دھنوں گا
باتیں اتنی
گیت اتنے
زندگی اتنی مری
عیش اتنا

شوق اتنا
جائے کیسے
آج کے دن
جاگ اٹھی ہے زندگی
کیا ہوا جو میرے گرد و اگرد زنداں کی فصیل
توڑ زنداں توڑ زنداں توڑ دے
اے مرے دل توڑ دے تُو
بندشوں کو توڑ دے!

روسی نظم

انّا اخمتووا / ادیب سہیل

انّا کی کتاب "شام" کی ایک نظم

شال کے اندر میں نے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو پکڑ رکھا ہے
میں آج کی رات اتنی پژمُردہ کیوں لگتی ہوں؟
شاید اس لیے کہ میں نے اُسے غمِ نا امیدی۔ تلخ شراب
بہت زیادہ پینے پر مجبور کیا
کیا میں اُس منظر کو بھول سکتی ہوں؟
کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر جا رہا تھا
اور اُس کا چہرہ انتہائی کرب کا مظہر تھا
میں زینے کی طرف دیوانہ وار دوڑی
اور گلی میں اُس کا تعاقب کیا
میں چلّائی ــــــ "سنو، رک جاؤ۔ میں تم سے مذاق کر رہی تھی"
تم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ ورنہ میں مر جاؤں گی"
اور وہ؟
وہ بڑا ہراساں سا، سرد مہری سے مسکراتے ہوئے بولا
"ہوا کی رہ گزر میں مت کھڑی ہو"

افریقی نظم

جوزف کریُوکی، کینیا (افریقہ)
مترجم: ابرار حسین

"لوٹ آؤ میرے محبوب"

لوٹ آؤ میرے محبوب تم ان گلیوں سے
جن میں بے مہر مکینوں کی نگاہوں کے تیر
منقسم کرتے ہیں انسانوں کو
اور دکانوں کے دریچے ہر دم
منعکس کرتے ہیں ہم سب کے تضادات کے رنگ
لوٹ آؤ
میری محفوظ محبّت بھری خلوت گہہ میں
اس میں محفوظ ہو تم لوگوں کی آرا سے
ڈھال ہے میرا بدن۔
میں چھپا لوں گا تمہاری اداسی کو
اپنی سیاہ آنکھوں میں
شمع کی لو نے بنائے ہیں جو دیوار پہ عکس
ایسے گم ہوتے ہیں اک دوجے میں وہ
جیسے کہ پہلو میں میرے تم
اور جب شمع بجھی میں نے یہ محسوس کیا
تمہارے بازو حمائل ہیں اور پھر جیسے
دھڑکنیں ایک ہوئیں
سانسوں کے سنگیت نے
تخلیق کیا وہ نغمہ
جس کا ثانی نہیں دنیا میں کوئی

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

پچھلے موسم کا پھول ـــــ مظہر امام

مظہر امام کا ادبی سفر گزشتہ نصف صدی سے زیادہ طویل عرصے پر محیط ہے اور ان کی سب سے بڑی خوبی، جسے میں مظہر امام کی ذاتی اور منفرد خوبی شمار کرتا ہوں ـــ یہ ہے کہ انھوں نے ادب کی خدمت ایک جان نثار عاشق کی طرح کی ہے۔ شاعری ان کے لیے شہرت، دنیاوی عزّت یا مختلف مقاصد کے حصول کا وسیلہ نہیں، ان کے اندر کی آواز ہے جو اشعار میں ڈھلنے اور ان کے جذبات کو آسودہ کرنے کے لیے بے قرار رہتی ہے۔ غزل مظہر امام کے مشاہدات کا ثمر بھی ہے اور ان کے تجربات کا حاصل بھی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مظہر امام نے شعری اظہار میں مسلسل ارتقا کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ "زخمِ تمنّا" اور "رشتہ گونگے سفر کا" ان کے اس طویل سفر کے اہم سنگ ہائے میل ہیں، جو اس سفر میں بہتی ہوئی واردات کی نشان دہی کرتے ہیں، لیکن مظہر امام ان سنگ ہائے میل پر رُکے نہیں، بلکہ تمنّا کا دوسرا قدم تلاش کرنے کے لیے آگے بڑھے اور پھر اس مقام پر بھی پہنچے جہاں شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے"

زبانی اور مکانی اعتبار سے اس مجموعۂ غزل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی معتدبہ تعداد میں غزلیں مظہر امام نے کشمیر میں قیام کے زمانے میں تخلیق کیں اور مظہر امام چونکہ زمان و مکان کو شاعری میں نظر انداز نہیں کرتے اور سمے کی چاپ کو سنتے اور سامنے کے منظر کو غائر نظروں سے دیکھتے ہیں اس لیے یہ سب کچھ ان کی شاعری میں فطری جوہر کی طرح سما جاتا ہے اور ایک بے ساختہ کیفیت شاعر سے قاری کے دل کی طرف سفر کرنے لگتی ہے۔

یہ پہلی برف ہے آنکھوں میں بھر لو ـــــ یہ موسم پھر کبھی اُجلا نہ ہوگا
پہاڑوں پر کہیں بارش ہوئی ہے ـــــ زمیں محوِ دعا ہے اور میں ہوں

اور مشاہدے کے تاثّر میں جب تلخی کا زہر سرایت کر جاتا ہے تو مظہر امام اس قسم کے شعر کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

گر رہے ہیں زرد پتّے پیڑ سے فالج کی طرح ـــــ وادیِ کشمیر ہے، بیمار کا بستر ابھی

اس کتاب میں مظہر امام نے قافیوں کے تنوّع کو ردیف کی ندرت سے کچھ اس طرح والبستہ کیا ہے کہ پوری غزل

لخت لخت مضامین پر مشتمل نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ ردیف کی سلکِ گوہریں میں بندھی ہوئی مسلسل غزل محسوس ہوتی ہے اور بعض غزلوں میں تو شاعر کا رویّہ بھی ردیف ہی سے متعیّن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:

ہم نے تو دریچوں میں سجا رکھے ہیں پردے — باہر جو قیامت کا ہے منظر، تو ہمیں کیا
ہاتھ اٹھتے ہی کٹا، چلیے یہاں سے چلیے — کیا دعا، کیسی دعا، چلیے یہاں سے چلیے

مظہر امام نے غزل کی روایتی حدود کو معنی آفریں انداز میں عبور کیا ہے۔ چنانچہ جب وہ پیش پا افتادہ علائم و رموز کو بھی مسّ کرتے ہیں تو معنی کی گرہ کو ایک نئے انداز میں کھولتے ہیں اور پسِ لفظ اسرار سامنے آتا ہے تو قاری کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔

اک تیغ اٹھی جیسے سب چوم رہے تھے — اب کے سرِ مقتل کوئی قاتل ہی نہیں تھا
سانپ کاٹیں گے اسے اور زہر ہم تک آئے گا — یہ تماشے بھی دکھائے گا بازی گر ابھی

مظہر امام کے لہجے میں نرمی بھی ہے اور خفگی بھی، وہ سمٹنے کے بجائے تقسیم کرنے میں زیادہ دل چسپی لینے لگے ہیں ان کے ہاں نامعلوم کو تلاش کرنے کا جذبہ زیادہ قوی نظر آتا ہے اور ہر حیرت ایک نئے سوال کو جنم دیتی ہے۔

ہے تیری بزم میں آخر کہاں جگہ میری؟ — چراغ بھی ہیں ترے اور دھواں بھی تیرا ہے
میں تھک کے بیٹھ رہوں یا قدم بڑھائے چلوں؟ — فنا بھی تیری ہے، نام و نشاں بھی تیرا ہے

"پچھلے موسم کا پھول" مظہر امام کی تازہ ترین شاعری کا مجموعہ ہے، لیکن اسے حالیہ دور کی اچھی اور نمائندہ شاعری کا مجموعہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ کتاب آدرش بک ہاؤس، سری نگر نے کشمیری حسن زیبائی سے شائع کیا ہے۔ قیمت صرف ۵۰ روپے۔

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں ـــــ مالک رام

حکومتِ ہند نے ۱۹۸۸ء میں ابوالکلام آزاد کا صد سالہ جنم دن منانے کا فیصلہ کیا تو اربابِ حل و عقد کو مولانا آزاد پر ایک کتاب شائع کرنے کا خیال بھی آیا اور اس کے لیے ان کی نظر مالک رام صاحب پر پڑی جن کی تدریسی کا بیشتر حصہ مطالباتِ آزادی میں گزرا تھا۔ مالک رام صاحب طالب علمی کے زمانے ہی میں "الہلال"، "البلاغ" اور مولانا آزاد سے شناسا ہو چکے تھے۔ وہ نیاز فتح پوری کے رسالہ "نگار" کے مستقل قاری اور اس کی جمالیاتی نثر سے متاثر تھے۔ مولانا آزاد کی تحریروں نے اس اثر کو دو آتشہ کر دیا اور وہ اس دور کی تحریروں میں ان کا تتبع بھی کرنے لگے اور بہت جلد اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے کہ نیاز فتح پوری نے مولانا آزاد کے تتبع اور تقلید کی شعوری کوشش کی تھی مالک رام صاحب نے اس بات کی داخلی شہادت نیاز فتح پوری کے ابتدائی کلام سے بھی حاصل کی ہے۔ مالک رام صاحب نے مولانا آزاد سے اپنے تعلق کا احوال اس کتاب کے پیش گفتار سے کہا ہے۔ انھیں مولانا سے ملاقات کا شرف بھی حاصل رہا اور ان سے مراسلت کا اعزاز بھی ملا اور اس سب سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہے کہ مولانا کے صد سالہ جنم دن پر کتاب مرتب کرنے کے لیے مالک رام صاحب ہی موزوں شخصیت تھے۔

اس کتاب میں مالک رام صاحب نے دوسروں کے مضامین جمع کر کے کتاب مرتب کرنے کا فرضِ کفایہ ادا نہیں کیا بلکہ گزشتہ تیس برس کے دوران انھوں نے مولانا آزاد پر جو مضامین خود لکھے تھے اور اب رسائل و جرائد میں منتشر پڑے تھے انھیں اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کے بیشتر مضامین ایسے ہیں جو مولانا آزاد کی زندگی میں چھپ چکے تھے اور شاید ان کی نظر سے بھی گزر چکے ہوں۔

مالک رام صاحب اردو زبان و ادب کے نامور محقق ہیں، اس کتاب کا پہلا مضمون "مولانا آزاد کی تاریخِ ولادت" خالصتاً تحقیقی مضمون ہے۔ ہمایون کبیر صاحب نے مولانا کی تاریخِ ولادت ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء لکھی ہے۔ "تذکرہ" میں ذوالحجہ ۱۳۵۵ھ اور تاریخی نام "فیروز بخت" درج ہے۔ مولانا مہر کا بیان ہے کہ:

"مولانا آزاد نے ایک موقع پر انھیں اپنی صحیح تاریخِ ولادت ۸ یا ۹ ذوالحجہ ۱۳۵۵ھ بتائی تھی جو ۱۷ یا ۱۸ اگست بنتی ہے۔"

مالک رام صاحب نے جنتری اور عیسوی تقویم سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء ان کی تاریخِ ولادت درست نہیں اور وہ ۹ر اگست سے ۸ر ستمبر ۱۸۸۸ء کے درمیان کسی دن پیدا ہوئے تھے۔

اس کتاب کا دوسرا مضمون مولانا آزاد (پہلے بیس سال) بھی تحقیقی نوعیت کا ہے۔ ان بیس سالوں کے بہت سے واقعات پردۂ اخفا میں ہیں، ان کا مستند ماخذ تو مولانا آزاد کی کتاب "تذکرہ" ہی ہے۔ تاہم مالک رام صاحب نے متعدد دوسرے ماخذات سے بھی استفادہ کیا ہے اور مولانا کی زندگی کے اس ابتدائی دور کو اس طرح اجمال میں سمیٹا ہے کہ یہ اس دور کی شہادت بن گئی ہے۔ مالک رام صاحب نے مولانا کی خدمات کا جائزہ بطور صحافی بھی لیا ہے۔ ایک باب ان کی خطابت کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ افکارِ آزاد کی روشنی میں تحریکِ آزادی کی مذہبی بنیاد دریافت کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ ایک باب اردو پر مولانا آزاد کے احسانات کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ "غبارِ خاطر" اور "تذکرہ" کا ذکر بھی علیحدہ ابواب میں کیا گیا ہے۔ مالک رام صاحب نے اس کتاب میں مولانا ابوالنصر غلام یٰسین آہ کا تعارف بھی کرایا ہے جو مولانا آزاد کے بھائی تھے اور جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں ان کی شاعری کے نمونے اور ان کی زندگی کے آثار بھی پیش کیے گئے ہیں "کچھ کرتے کے کام" کے تحت مولانا آزاد کے مداحوں کی توجہ ایسے موضوعات کی طرف دلائی گئی جو ابھی تشنۂ عمل ہیں، مالک رام صاحب کی یہ کتاب تذکرہ بھی ہے اور تنقید بھی، اس کے مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے، لیکن کوئی مضمون بھی عقیدت اور محبت کی فراوانی سے تہی نہیں۔ مکتبۂ جامعہ دہلی کے ناظم الامور شاہد علی خاں نے اس کتاب کو بے حد خوبصورت کتابت اور اعلیٰ طباعت میں پیش کیا ہے۔ ۲۲۴ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۵۱ روپے ہے۔

انشائیہ پچیسی ——— ڈاکٹر جاوید وشسٹ

ڈاکٹر جاوید وشسٹ کو اردو ادب میں ایک ماہر دکنیات کی حیثیت حاصل ہے۔ انھیں مولوی عبدالحق کے شاگرد ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ انھیں کے فیضِ مجلس نے ڈاکٹر وشسٹ صاحب کے دکنی ادب کے گم شدہ شہ پاروں

پر تحقیق کی راہ دکھائی۔ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان تھا "اسد اللہ وجہی ۔ حیات اور کارنامے"۔ ان کی ادبی شہرت کا ایک اور باعث ان کا یہ نظریہ ہے کہ انشائیہ مغرب سے درآمدہ صنفِ ادب نہیں، بلکہ یہ صنفِ ادب دکن میں قطب شاہی دربار کے اس ادبی معرکے سے پیدا ہوئی جو کم و بیش تیس برس تک ملّا وجہی اور ملّا غواصی کے درمیان جاری رہا۔ ڈاکٹر وشسٹ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ملّا وجہی اردو انشائیے کا بانی ہے اور اس کے اوّلین نقوش "سب رس" میں دست یاب ہیں۔

فی الوقت ڈاکٹر جاوید وشسٹ صاحب کے اس موقف سے بحث مقصود نہیں ہے کہ:

"ہمارا انشائیہ کلیتہً ہمارا اپنا انشائیہ ہے۔ ملّا وجہی اردو انشائیہ کا باوا آدم ہے۔ جس وقت عالمی ادب میں انشائیہ نے جنم لیا۔ کم و بیش اسی وقت ہمارا انشائیہ بھی عالمِ وجود میں آیا۔"

بلکہ گزارش یہ کرنی ہے کہ ملّا وجہی کو پڑھتے پڑھتے ڈاکٹر جاوید وشسٹ صاحب بھی نثر کی طرف آگئے۔ ان کی اس قسم کی تخلیقی نثر کا ادب پارہ رسالہ "دستگیر" دہلی میں "اسیرِ قفس" کے عنوان سے چھپا۔ اس قسم کی تحریروں کا انتخاب ڈاکٹر صاحب نے "انشائیہ پچیسی" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں انھوں نے انشائیے کی متذکرہ بالا بحث کو ایک دفعہ پھر تازگیِ نظر سے پیش کیا ہے اور اس عمل میں انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید محمد حسنین، ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر اندر جیت لال کے مضامین انشائیہ اور نظریات پر بھی بحث کی ہے، لیکن اس بات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے کہ انگریزی انشائیہ کے برعکس اردو انشائیہ نے اب اپنی بوطیقا مرتّب کر لی ہے اور جو انشائیہ اردو میں لکھا جا رہا ہے وہ اپنا مزاج مشرقی رکھتا ہے اور اس میں عصری آگہی کا عنصر نمایاں ہے۔ ڈاکٹر جاوید وشسٹ موضوع کی خوقیت ثابت کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں اور اکثر اوقات "جوابِ مضمون" کے مدار میں داخل ہو جاتے ہیں اور اکثر اوقات حقیقت کا نیا زاویہ سامنے لانے کے بجائے قاری کو دیکھی ہوئی حقیقت کو بار بار دیکھنے کا موقع عطا کرتے ہیں اور بعض اوقات تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ مناظر اور اشیا سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اس پر اپنا کٹیلا طنز پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود موضوع سے فاصلے پر رہتے ہیں تو موضوع بھی ان کی طرف التفات سے نہیں دیکھتا، بلکہ اطلاعاتی نوعیت اختیار کر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر لنگوٹ، لنگوٹا، لنگوٹی سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"لنگوٹ کی سیرت، لنگوٹا کی طینت اور لنگوٹی کی سرشت "لِنگ"، (عضوِ تناسل) اور "اوٹ" سے عبارت ہے۔ ویدک کال ہی سے ہندوؤں کا ایک طبقہ جو "شیویہ" کہلاتا ہے، آج بھی "شوِ لنگ" کی پوجا کرتا ہے۔ شوِ لنگ ان کے عقیدے کے مطابق تسلسلِ تخلیقِ آدم کی ایک عریاں مگر مقدّس علامت ہے اور اسی لیے استری پُرش سمبھوگ کو بھی فعلِ مقدّس قرار دیا ہے۔ لہٰذا شوِ لنگ کو نہ لنگوٹ درکار ہے نہ لنگوٹا اور نہ کسی لنگوٹی کی حاجت ہے۔"

اس کتاب میں "خیر کا فراڈ"۔ "ریاکار تولیہ"۔ "نوسو چوہے، بلی اور حج"۔ "للو پنجو"۔ "عسک وسک"، "گرم حلوے کا گولا" اور "موبائیل وارڈن" جیسے عنوانات پر چند ایسے مضامین پیش کیے گئے ہیں جن میں اشیا، مظاہر اور مناظر کو قدرے ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھا گیا ہے اور پُر لطف مزاح اور ظرافت پیدا کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جاوید گرد و پیش کو ایک عالم کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے عالم کی طرح پیش بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مزاج محض بہجت آفریں ہی نہیں معلومات افزا بھی ہے۔ ڈاکٹر جاوید وشسٹ نے انھیں انشائیہ شمار کیا ہے۔ میں ان سے اتفاق نہیں کرتا لیکن ان پر معترض بھی نہیں ہوں اور انشائیہ کی پہچان کا مسئلہ قاری پر چھوڑتا ہوں۔ یہ کتاب سلوجہ پرکاش، گل مہر پارک، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے کتابت اُجلی اور طباعت خوش نظر ہے۔ ۱۲۴ صفحات کی قیمت ۴۵ روپے رکھی گئی ہے

یازدہ ـــــ ساحل احمد

ساحل احمد نے "یازدہ" میں اردو کے گیارہ نامور غزل گو شعرا کا منتخب کلام پیش کیا ہے۔ یہ شعرا ہیں ولی دکنی میر تقی میر، میرزا رفیع سودا، خواجہ حیدر علی آتش، اسد اللہ خاں غالب، حسرت موہانی، فانی بدایونی، یگانہ چنگیزی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض اور ناصر کاظمی ـــ گویا اس کتاب میں کم و بیش تین سو سال کے دوران ظہور میں آنے والی غزل کا ارتقائی خاکہ پیش کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب کی ابتدا میں ساحل احمد نے ایک خیال انگیز مقدمہ لکھا ہے جس میں غزل کو ایک مخصوص تہذیب کی علامت تسلیم کیا گیا ہے اور اس غزلیہ تہذیب پر تنقید کی گئی ہے۔ ساحل احمد نے ابتدائی غزل کو جنگل کی تہذیب کی پروردہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ

> "جب یہ جنگل کی حدوں سے اور صوفیوں کے خلوت کدوں سے نکل کر شہری حدود میں داخل ہوئی تو بادشاہی مزاج کی ایسی عادی ہوئی کہ خود اپنی طفلانہ معصومیت، صوف و واقفیت اور ہندوی ارضیت کی دشمن بن گئی۔۔۔۔ زمانۂ طوائف الملوکی میں بعضوں کے مشاطہ گری سے وہ تصنع پسند بھی ہو گئی جس نے تصنع پسند مضحک پہلوؤں کو فروغ دیا۔۔۔۔ مگر فرنگی طمانچے نے اس مطلس اور مصنوع تہذیب کا منھ پھیر کر مغربی کلچر رائج کیا جس نے غزل کو دوبارہ کلچر لائز ڈ کیا۔ جنگل کی سبز روایت کی تجدید غزل کی نئی زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔"

غزلیہ تہذیب کے اس بنیادی نظریے سے ساحل احمد نے اردو غزل کے ارتقا کی کڑیاں مرتب کی ہیں اور اس عمل میں انھوں نے متذکرہ بالا گیارہ شعرا کو ہی موضوعِ بحث نہیں بنایا بلکہ دورِ قدیم، دورِ وسطیٰ اور دورِ جدید کے بیشتر نمائندہ شعرا کے اقتباس سے اس تھیسس کو جس سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، روشن کیا ہے اور اس تضاد کو بھی اُجاگر کیا ہے جو مختلف شعرا کے ذہنی اور فکری رویّوں کی جانی اور انجانی سمتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

ساحل احمد اردو ادب کے سنجیدہ فکر نقاد اور شاعر ہیں، وہ ایک مخصوص اسلوب میں سوچتے ہیں اور اکثر انوکھے نتائج نکال لاتے ہیں۔ غزل کے بارے میں ان کا متذکرہ بالا نظریہ بھی توجہ کا مستحق ہے اور یہ ایک نئی خیال انگیز بحث کا نقطۂ آغاز بھی بن سکتا ہے۔

۱۶۵ صفحات کی یہ کتاب رائٹرز گلڈ۔ ۳۰ چک الہ آباد سے صرف ساڑھے سات روپے میں دستیاب ہے۔

حقی کا ایک نادر شعری کارنامہ

قہرِ عشق

شیکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامے انطنی کلوبطرہ کا منظوم و مقفیٰ ترجمہ

صفحہ بہ صفحہ اصل انگریزی متن کے ساتھ

یہ شیکسپیئر کے سب سے طویل رومانی ڈرامے کا اردو روپ ہے جس میں سیاست سے لے کر محبت تک، اور بری و بحری جنگوں سے لے کر عشرت گاہوں کی رنگینیوں تک دل چسپ اور مسحور کن واقعات و سانحات کی ایک دنیا سمائی ہوئی ہے۔ کلوبطرہ کا منفرد کردار اور اس کے مختلف روپ کہ وہ عورت بھی ہے ملکہ بھی، سیاست میں الجھی ہوئی اور دام محبت میں بھی گرفتار۔ اُس کی طنازی، طراری، چہلیں، رنگ رلیاں، خواصوں اور شاگرد پیشہ کی آپس کی چھیڑ چھاڑ، اور پھر اس تمام افسانے کا حسرتناک انجام جو ملکہ کی خودکشی پر ہوا۔ کلوبطرہ کے آخری لمحات کی دل گداز تصویر، غرض ایک بے مثل ادبی کارنامہ ہے، زبان و بیان کی خوبیوں سے مالا مال۔ کہیں زور خطابت ہے تو کہیں روزمرہ کا لطف اور کسی ایک سطر پر بھی ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر میاں بشیر احمد مرحوم نے بھرے جلسے میں کہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے اصل یہ ہے اور ترجمہ شیکسپیئر نے کیا تھا۔ حقی صاحب کے بقول یہ اردو اسلوب کی ایک آزمائش تھی۔ اُردو اس میں کس طرح پوری اتری ہر پڑھنے والا اس کی گواہی دیگا۔

انجمن ترقی اردو نے مترجم کے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے رنگین باتصویر سرورق کے ساتھ اہتمام سے عمدہ کاغذ پر شائع کیا۔ قیمت ۷۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

اقبال کے کرم فرما ______ مصنّف: ماسٹر اختر
(تنقید)

صفحات: ۱۳۳۔ قیمت: ۲۵ روپے

پتا: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی

ڈاکٹر عباس علی خان لمعہ کا شمار ان اصحاب میں ہوتا ہے جن کو علامہ اقبال سے مراسلت کا شرف حاصل رہا۔ اقبال نامے میں ان کے ۲۹ خطوط شامل ہیں۔ گو اقبال نامے کی اشاعت کے وقت ہی سے ان کے خطوط کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا رہا اور یہ شک اس وجہ سے تھا کہ ۱۸ سال کی عمر میں جب لمعہ انٹرنس کے طالب علم تھے، وہ علامہ سے ملے مگر چند ہی سال میں وہ علامہ کے مزاج میں اس قدر دخیل ہو گئے کہ علامہ جنھوں نے مئی ۲۹ میں ان کے اشعار پر اصلاح سے معذرت فرمائی تھی (خط ۲) اور بعد میں ان کو شعر و سخن میں کم وقت صرف کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ (خط ۶) ایک سال بعد ہی ان کے کلام میں ایک وجدانی کیفیت پانے لگے جس کو وہ من جانب اللہ قرار دیتے ہیں۔ (خط ۱۰) اور چار ماہ بعد ہی ان کو شعر و سخن میں زیادہ وقت صرف کرنے کا مشورہ دیتے ہیں (خط ۱۱) اور مئی ۳۵ میں تو ان کی مثنوی سے "استفادہ حاصل" کرتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں لمعہ صاحب کی عمر ۲۴ سال کے قریب ہونا چاہیے۔ ۲۴ سالہ ایک نوجوان کی مثنوی سے علامہ کا استفادہ فرمانا بڑے اعزاز کی بات ہے۔ لمعہ ایک الہامی شاعر بن جاتے ہیں جن پر تجلیات کی بارش بڑی تیزی سے ہو رہی ہے اور اقبال جیسا عظیم صوفی اور فلسفی شاعر اس سے متاثر ہو رہا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ لمعہ نے اپنی نظمیں، غزلیں، مثنوی، افسانے سب ہی کچھ علامہ کو ارسال کیے۔ علامہ نے نہ صرف ان کو پسند فرمایا بلکہ ان سے استفادہ تک فرمایا، مگر یہ قیمتی جواہر پارے آج تک کیوں منصۂ شہود پر آ سکے؟

فاضل مصنّف نے بڑی تفصیل سے مقامات، تواریخ، واقعاتی تواتر، نفسِ مضمون اور طرزِ عبارت کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ لمعہ کے نام علامہ کے بیشتر خطوط فرضی ہیں اور ان کے دلائل کافی وزنی ہیں۔

اس انکشاف اور تجزیے کی روشنی میں محققینِ اقبال پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اقبال نامے کے جملہ خطوط کا از سرِ نو جائزہ لیں اور فرضی خطوط کو کتاب سے حذف کر دیں اور مشکوک خطوط کی نشاندہی فرمائیں۔ یہ کام

جس قدر جلد کر لیا جائے۔ اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ وقت گزرنے کے بعد ان پر اس قدر گرد جم جائے گی کہ ان کی چھان پھٹک بہت زیادہ دشوار ہو جائے گی۔

کاغذ سفید، طباعت ستھری کتاب مجلد اور رنگین گرد پوش سے مزین ہے۔

——— محمد احمد سبزواری

تحریک پاکستان میں مسلم صحافت کا کردار (تاریخ) مصنف: ڈاکٹر عقیرہ حامد

صفحات: ۱۲۶۔ قیمت: ۲۵ روپے

پتا: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۳۰-۷/این، سمن آباد لاہور

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جہاں مسلمانانِ ہند کی سیاسی، سماجی، تعلیمی، اقتصادی، ثقافتی اور ذہنی انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تھا وہاں مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی سازشوں اور انگریزوں کی پشت پناہی میں ہندوؤں کی منافقتوں کا ایک طویل سلسلہ جاری تھا۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں مسلمانوں کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانے، ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے، ان کی تعلیمی، معاشی و معاشرتی حالت کو بہتر بنانے میں سرسیّد نے جہاں بہت سے تعمیری و فلاحی اقدامات کیے وہاں انھوں نے یہ بھی سوچا کہ مسلمان صحافتی زندگی کو اپنائے بغیر ایک علیٰحدہ قوم کی حیثیت سے اپنا وجود منوانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان مقاصد کے پیشِ نظر انھوں نے تہذیب الاخلاق کے علاوہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ) کا اجرا کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دو قومی نظریے کے تحت مسلمانوں نے صحافت کے ذریعے ایک علیٰحدہ مسلم مملکت کے قیام کی غرض سے جد وجہدِ آزادی کا آغاز کیا۔

سرسیّد کے بعد جن اخبارات نے ۱۹۴۷ء تک ہندو انگریز اخبارات کے جواب میں مسلمانوں کے نظریات، افکار، خیالات کو واضح کرنے اور ان کے مطالبات کو منوانے میں اہم رول ادا کیا ان میں ہفت روزہ "مذہب" لکھنؤ، پیسہ اخبار، زمیندار، احسان، سیاست قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء کا عہد مسلم صحافت کی تاریخ میں اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اس دور میں تحریکِ آزادی پورے عروج پر تھی۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے اخبارات نے مسلمانوں سے مخالفت و مخاصمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی ان میں انگریزی اردو کے مقامی زبانوں کے اخبارات بھی شامل تھے۔ مسلمانوں نے ان کے جواب میں اردو کے علاوہ انگریزی اخبارات بھی جاری کیے۔ زوردار اداریے لکھے، سلسلہ وار مضامین شائع کیے، مسلم لیگ کی پُرزور حمایت کی۔

ڈاکٹر عقیرہ حامد لائقِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے زیرِ تبصرہ کتاب میں اس سترہ سالہ (۱۹۳۰ء ۔ ۱۹۴۷ء) مسلم صحافت کا نہایت سلیقے سے احاطہ کیا ہے۔ چونکہ ان کا یہ مقالہ ایم اے کے لیے لکھا گیا تھا اس لیے شاید اس میں تمام مسلم اخبارات کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود جو مواد اس کتاب میں فراہم کیا گیا ہے وہ بلاشبہ قابلِ قدر

اور تحریکِ پاکستان کی تواریخ میں ایک اہم باب کے اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

—— ڈاکٹر وفا راشدی

مٹّی کی خوشبو —— مصنّف: احمد سعدی

افسانے

صفحات: ۱۴۳۔ قیمت: ۵۰ ٹاکا

پتا: شاہکار پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس ۳۳۶۷ ڈھاکا۔۲

احمد سعدی کی تصنیف پر بات کرتے ہوئے یادیں پرے باندھے کھڑی ہوئی ہیں۔ کس کی طرف توجہ کروں اور کسے نظر انداز کروں۔ میرے لیے تو ساری یادیں حرزِ جاں ہیں۔ مشکل میں ہوں کہ کہاں سے شروع کروں اس لیے اس بات کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

احمد سعدی قیامِ پاکستان کے پہلے سے افسانہ لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے افسانے لکھنے کا آغاز ۱۹۴۶ء سے کلکتے میں کیا تھا اور جب ہی سے سقوطِ ڈھاکا تک ہم دونوں ایک شہر سید پور میں مقیم رہے۔

احمد سعدی افسانہ نگاری کے میدان کے کہنہ مشق کھلاڑی ہیں۔ بنگلہ ادب کو اردو میں ایک تواتر سے منتقل کرنے کے کام میں احمد سعدی کا نام اہم ہے (دوسرا نام یونس احمر کا آتا ہے جو بہت پہلے سے ترجمے کر رہے تھے) انھوں نے مشہور بنگلہ ناول نگار بمل منترا کے معروف ناول "کوڑیوں کے مول" اور "صاحب بی بی غلام" کے تراجم "نقوش" میں چھپوائے۔ بنگلہ زبان کے مقبول اسٹیج ڈرامے "سراج الدولہ" کا ترجمہ بھی "نقوش" ہی میں چھپا۔ "ماہِ نو" کی پرانی فائلوں میں احمد سعدی کی ترجمہ کی ہوئی بے شمار بنگلہ کہانیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

احمد سعدی کا پہلا افسانوی مجموعہ "دودِ چراغِ محفل" جسے آپ احمد سعدی اور س۔ م ساجد کے افسانوں کا مشترک مجموعہ کہہ سکتے ہیں، عرصہ ہوا منظرِ عام پر آ کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس کے بعد "مٹّی کی خوشبو"..... ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جس کے تمام تر افسانے ان کے اپنے ہیں۔

یہ افسانے سقوطِ ڈھاکا اور اس کے مابعد کے اثرات اور رونما ہونے والے حالات سے متعلق ہیں۔ دراصل سقوطِ ڈھاکا کا سانحہ اتنا بڑا تھا کہ ایک عرصہ تک یہ تخلیقی فن کاروں کا موضوع بنا رہے گا۔

احمد سعدی چونکہ ۴۴، ۴۵ سال سے مسلسل افسانے لکھ رہے ہیں اس لیے مشق و مزاولت کے اس طویل عرصے نے ان کے سامنے فنّی معیار متعیّن کر دیا ہے۔ وہ معیاری افسانے کی فنّی خوبیوں سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ کسی بات کو فن کارانہ انداز میں افسانہ بنا دینے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں۔ احمد سعدی کی اس فن کارانہ گرفت میں بنگلہ ادب سے گہری وابستگی نے بھی مدد بہم کی ہے۔ ان کی کہانی "پاگل ہاتھی" اور "مٹّی کی خوشبو" اس خصوصیت کی اچھی مثالیں ہیں۔

کتاب کی طباعت و کتابت معیاری ہے۔ ایسی اچھی کتاب پیش کرنے کے لیے اس کے مہتمم س۔ م ساجد

داہل تحسین ہیں جو خود بھی نئی نسل کے ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ سرورق کی انفرادیت بنگلہ آرٹ ہے۔

——— ا۔س

آئینہ ریزے ——— مصنف: احمد الیاس
(شاعری) صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: ۵۰ ٹاکا
پتا: شاہکار پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۴۳۶۴، ڈھاکا ۲

"آئینہ ریزے" احمد الیاس کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس کا شاعر مرحوم مشرقی پاکستان کے اس ادبی قافلے کا ایک بچھڑا ہوا مسافر ہے کبھی جس میں ہم بھی شریک تھے۔ سقوطِ ڈھاکا نے ہمارے اس اشتراک کو دو نیم بلکہ سہ نیم کر دیا۔ نتیجتاً اس ادبی قافلے کے کچھ افراد ہندوستان چلے گئے، کچھ پاکستان آ گئے اور کچھ وہیں بنگلہ دیش میں مقیم ہیں۔ احمد الیاس کا شمار آخر الذکر میں ہوتا ہے۔

ممکن ہے "آئینہ ریزے" میں ایک قاری کو وہ متنوع تبدیلیاں کم کم نظر آئیں جو پچھلے پندرہ بیس برسوں میں اظہار و بیان اور ہیئت کے تجربے کی سطح پر رونما ہوئی ہیں، لیکن ان تبدیلیوں کی توقع بنگلہ دیش کے اردو ادیبوں سے اس لیے نہیں کی جا سکتی کہ سقوطِ ڈھاکا کے بعد ایک طویل عرصے تک ان کی اور ان کی زبان کے لالے پڑے رہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کے ادیب و شاعر ادب میں "مین اسٹریم" سے تقریباً کٹ کر رہ گئے اور اس کا اس طرح فائدہ نہ اٹھا سکے جس طرح پاکستان اور بھارت کے ادیبوں نے اٹھایا۔ اس نامساعد صورتِ حال میں بنگلہ دیش میں مقیم ادیبوں اور شاعروں کے لیے اپنے ذوق کو زندہ رکھنا ہی ایک سنگین مسئلہ بن گیا۔ چہ جائیکہ ادب میں ہر نوع تجربات

آفریں ہے احمد الیاس اور ان کے دوسرے بہت سے ساتھی ادبا و شعرا پر جنھوں نے اس بادِ مخالف کی زد پر اپنے ذوق کا چراغ جلائے رکھا اور اس قابل ہوئے کہ اپنے مجموعۂ نظم و نثر کو کتابی صورت میں شائع کر سکیں۔

"آئینہ ریزے" اس لحاظ سے دوسرے شعری مجموعوں سے مختلف ہے کہ اس میں دکھوں کے تجربے جداگانہ نوعیت کے ہیں۔ یہ دکھ جن واردات و سانحات کے نتیجے میں آئینہ ریزے کے شاعر کے تجربے میں آئے اور بعد ازاں ایک مخصوص لب و لہجے کے ساتھ اس کا شعری سرمایہ بنے اس کی تلاش ان شعرا کے یہاں بے سود ہے جو سقوطِ مشرقی پاکستان کے لہو لہو منظر سے گزرے ہی نہیں۔

احمد الیاس نے اپنے منظوم کلام میں جن دکھوں کا اظہار کیا ہے وہ آنکھوں دیکھے ہیں۔ وہ شنید کے ذریعے نہیں بلکہ دید کے ذریعے پہلے ان کے احساس میں اترے اور پھر شعر کے قالب میں ڈھلے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی اثر آفرینی بھی شنیدہ سے مختلف ہو گی۔ چند نمونے دیکھیے۔

یہ رفاقت بھی غنیمت ہے کہ اس لمحے کے بعد ۔ کون ہم میں سے کدھر جائے کوئی ٹھیک نہیں

———

سورج کی تیز کرنوں سے جو بچ گئے انھیں   دیوار سے اُتر تی ہوئی دھوپ کھا گئی

الیاس حال یہ ہے کہ اب پوچھتا ہوں روز   یہ اپنا گھر ہے یا میں کسی اور گھر میں ہوں

شاخِ شجر سے ٹوٹے زمانہ گزر گیا   اب تک اڑا رہی ہے ہوا کُو بہ کُو مجھے

کبھی غم ہے کبھی غم کی خوشی ہے   یہی گویا اب اپنی زندگی ہے

احمد الیاس غزل و نظم یکساں آب و تاب سے کہتے ہیں۔ ان کے باب میں یہ کہنا مشکل ہے کہ بنیادی طور پر وہ غزل کے یا نظم کے شاعر ہیں۔ آئینہ ریزے کی نظموں کا موضوع بھی سقوطِ ڈھاکا اور اس کے مابعد کے اثرات ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی آئینہ ریزے ہمارے شعری ادب کا ایک اچھا اضافہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کا مخصوص پس منظر رکھتا ہے۔

کتاب اہتمام سے چھپی ہے۔ شاہکار پبلی کیشنز کی یہ خدمات قابلِ ستائش ہیں۔

——— ا۔س

اسلوبیاتِ میر

مصنّف

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

قیمت: ۲۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

گردوپیش

مشہور ادیب اُپندر ناتھ اشک کی انجمن میں آمد

اردو اور ہندی کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس اُپندر ناتھ اشک گزشتہ دنوں کراچی کے دورے پر آئے تو انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر دفتر میں بھی تشریف لائے۔ انجمن کی طرف سے منعقدہ اس تقریب میں شہر کے سربرآوردہ ادیبوں نے بھی شرکت کی۔ پہلے ڈاکٹر اسلم فرخی مشیر علمی و ادبی انجمن نے مہمان کا حاضرین سے تعارف کرایا اور خیر مقدمی کلمات کہے۔ اس کے بعد مظفر علی سید نے اُپندر ناتھ اشک سے اجازت لے کر سوال کیا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ افسانہ نگاری کے چار ستون کرشن چندر، بیدی، منٹو اور چغتائی کے ساتھ آپ کا نام نہیں؟ اس پر اُپندر ناتھ اشک نے کہا کہ مذکورہ چار ادیبوں کی بہ نسبت میرا تذکرہ کم ہونے کی وجہ میں خود ہوں۔ اس راہ میں ایک تو میری تنک مزاجی رکاوٹ بنی دوسرے میں مصلحت کیشی کے لفظ سے نا آشنا ہوں۔ پھر یہ کہ میں اپنی ضرورت کے تحت بغیر معاوضے کے نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس کی ایک اور وجہ نقادوں کی گروہی مصلحت بھی ہے اور تیسری وجہ وہ ہنگامہ آرائی ہے جو منٹو اور عصمت کے بعض افسانوں کی وجہ سے ہوئی اور بات کورٹ کچہری تک پہنچی۔ ظاہر ہے ہنگامہ آرائی شہرت کا دوسرا نام ہے۔

پھر جب ان سے کرشن چندر اور منٹو وغیرہ کی ادبی خصوصیات کے بارے میں فرداً فرداً پوچھا گیا تو اُپندر ناتھ اشک نے کہا، اگرچہ منٹو سے میری ہمیشہ چلتی رہی، میری اس کی قلمی لڑائی بھی ہوئی لیکن یہ کہے بنا نہیں رہوں گا کہ وہ واقعی فن کار تھا۔ وہ معاشرے کا حساس فرد تھا اور معاشرے کی بُرائی اور دکھوں پر غصے کا اظہار کرتا تھا۔ یہی غصہ اس کے افسانوں میں ڈھل کر اسے سب سے منفرد بنا جاتا تھا۔ بیدی کے افسانے کی اساس بہت باریک احساس پر ہے اور وہ اس کے اردگرد افسانے کا خوبصورت جال بُننا جانتا تھا۔ کرشن چندر کے بارے میں کہا کہ وہ میرے نقطۂ نگاہ سے افسانہ نگار نہیں، بلکہ باکمال انشا پرداز تھا۔ اس کو ابتدائی چند سطور لکھنے میں بڑی مشکل ہوتی تھی۔ اپنے گرد و پھاڑ پھاڑ کر کاغذ کے انبار لگا دیتا تھا۔ لیکن جب وہ ابتدائی چند سطور میں وہ کچھ بیان کر چکتا تھا جو وہ چاہتا تھا تو پھر اس کا قلم بے محابا چل پڑتا تھا اور صفحوں کے صفحے لکھ مارتا تھا اور اس وقت اس کے قلم کی روانی دیکھنے کی ہوتی تھی۔ اتنا رواں قلم ہمارے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ عصمت چغتائی کے بارے میں اُپندر جی اتنا کہہ کر رہ گئے کہ "اُن کی

شہرت ان کے مخصوص موضوع اور اس کا بیان ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔"

اُپندر جی کی گفتگو ایسی تھی کہ وہ بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں، لیکن ہمارے درمیان وقت آگیا اور ہم نے ان کے صاحبزادے جو ہندی بلکہ اردو نما ہندی کے معروف شاعر ہیں، سے تازہ کویتا سنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے کئی اچھی کویتائیں سنائیں۔ آخر میں صدرِ انجمن نورالحسن جعفری نے اُپندر جی کی انجمن میں آمد پہ مسرت کا اظہار کیا۔

دورانِ گفتگو اشک صاحب نے بتایا کہ وہ کوئی سو کتابیں ہندی میں لکھ چکے ہیں اور اردو میں بھی ان کی تصانیف چالیس کے لگ بھگ ہیں۔ پہلا افسانہ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں لکھا تھا اور وہ ان چار ستونوں سے دس برس پہلے سے ہی افسانہ نگاری میں مصروف تھے۔

اُپندر ناتھ اشک کے ساتھ ایک شام

انجمن ترقی اردو پاکستان اور ادارۂ یادگارِ غالب کراچی کے اشتراک سے نیپا آڈیٹوریم میں اُپندر ناتھ اشک کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ تقریب کا پہلا مضمون معروف افسانہ نگار و ناول نویس انور عنایت اللہ نے پڑھا۔ مضمون مختصر اور دل چسپ تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اشک جی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اشک صاحب اردو کے بزرگ ترین مصنف ہیں۔ ان کا قلم ۱۹۲۶ء سے مسلسل چل رہا ہے اور ان تھک ہے۔ ان کے ہم عمر عموماً برسوں تک آتے آتے تخلیق کا میدان چھوڑ کر تنقید کی طرف نکل آتے ہیں، لیکن اشک صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اتنے اوصاف بہت کم لکھنے والوں کے یہاں یکجا ہوتے ہیں جیسے اشک صاحب کے یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ اشک صاحب بہ یک وقت ناول نگار، افسانہ نویس، شاعر، ڈرامہ نگار ہیں، اداکاری بھی کی ہے اور ان کا شہپ قلم ہندی، اردو اور پنجابی میں یکساں چلتا ہے۔

مختار زمن نے اپنے مخصوص انداز میں اشک صاحب پہ ایک خاکہ پڑھا جسے حاضرین نے دل چسپی سے سنا۔ اس کے بعد اشک جی اظہارِ خیال کرنے کے لیے اُٹھے، پہلے انھوں نے یہ عذر کیا کہ میں کوئی مقرر نہیں، بس جیسے جیسے ذہن میں باتیں آتی جائیں گی، کہنے کی کوشش کروں گا، اور پھر انھوں نے اپنے حوالے سے انواع و اقسام کی باتیں کیں جن کا ان کی نج سے بھی تعلق تھا اور ادب اور ادبی شخصیات کا حوالہ بھی بنتی تھیں۔ حاضرین نے ذوق و شوق سے ان باتوں کو سنا اور خوب خوب داد دی۔ پھر اشک جی نے اپنی چند ہندی نظمیں سنائیں۔

درمیان میں انجمن ترقی اردو اور ادارہ یادگارِ غالب کی طرف سے اشک جی کی گل پوشی ہوئی۔ بعد ازاں انھیں انجمن کی طرف سے صدر انجمن نے "نشانِ سپاس" پیش کیا۔

صدر انجمن نورالحسن جعفری نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان اور وفاق کی علامت ہے۔ بعض دستوری مشکلات کی وجہ سے اردو کا سرکاری سطح پہ ابھی تک مکمل نفاذ نہیں ہو سکا ہے۔ کوئی کہتا ہے اردو مہاجروں کی زبان ہے، کوئی کہتا ہے کہ یہ زوال پذیر معاشرے کی زبان ہے، حالانکہ اس زبان کی خدمت میں پنجاب کا

وافر حصّہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ حالیہ برسوں میں انجمن نے ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور دوسرے بہتیرے پاکستانی مصنّفوں کو ان کی گراں قدر ادبی خدمات پر خراجِ تحسین اور نشانِ سپاس پیش کیا ہے۔ یہ لوگ تو مہاجر نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو کہاں سے مہاجروں کی زبان ہوگئی۔ یہ تو عوام کی زبان ہے۔ اس میں عربی، فارسی، ترکی، پنجابی اور سندھی کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ شامل ہیں۔ اردو کو دراصل سب کی زبان ہونے پر فخر ہے۔

ایشیائی رائٹرز ورکشاپ ۸۹ء اسٹاک ہوم

الفرڈ نوبل کے شہر اسٹاک ہوم سویڈن میں یکم اکتوبر سے ۷ اکتوبر تک "ایشین رائٹرز ورکشاپ ۸۹ء" کا اہتمام کیا گیا۔ سائیں سُچا اور آپ کے ساتھیوں نے پاکستان پیپل کلب اور پاک کمیٹی کے تعاون سے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد ادبی ورکشاپ میں یورپ اور شمالی امریکہ میں مقیم پاکستانی اور ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں نے "شناخت کا سفر" اور "ہجرت کے بعد انسان کی ذہنی اور تجرباتی زندگی کے مسائل" کے موضوع پر کھُل کر اپنے خیالات اور تجربات کا اظہار کیا۔ اس ورکشاپ میں نیویارک سے افسانہ نگار و شاعرہ رانی نگندر، شکاگو سے شاعر افتخار نسیم، اوسلو۔ ناروے سے افسانہ نگار سعید انجم، ڈنمارک سے افسانہ نگار و شاعر نصر ملک، چاند شکلا، ابو طالب اور صفدر علی، ٹورانٹو۔ کینیڈا سے شاعرہ و افسانہ نگار خالدہ سہیل اور ڈراما نویس و شاعر جاوید دانش، برلن جرمنی سے مصوّر محسن زیدی۔ ساتھ ہی سویڈن سے شاعرہ و افسانہ نگار عرفان ملک، مسعود قمر، احمد فقیہہ اور سائیں سُچا نے شرکت کی۔ مقامی سویڈش شعرا نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

مباحثے کے علاوہ "شبِ افسانہ" میں پانچ افسانے اور ایک ڈرامہ پیش کیا گیا۔ مشاعرے میں اردو، پنجابی، ہندی، انگریزی اور سویڈش کلام سنایا گیا۔ سویڈش شعرا کا کلام اردو میں اور اردو کا کلام سویڈش میں ترجمہ کر کے سنایا گیا۔ مہمان قلم کاروں کو سویڈش شعرا اور عوام نے نہ صرف سراہا بلکہ سویڈش پریس اور میڈیا نے اپنے ایشیائی قلم کاروں کا انٹرویو بھی لیا اور مستقبل قریب میں ساتھ مل کر ایک پراجکٹ پہ کام کرنے کا پروگرام بنایا۔ بیرونِ ملک مقیم قلم کاروں کے نثر اور نظم میں اظہار کے مسائل نئی امیجری اور نئے کلچر کی آمیزش کے سلسلے میں بھی سیر حاصل مباحثے ہوئے۔ اسی دوران سائیں سُچا کی کتاب "ساحری" (ساحر لدھیانوی کی نظموں کا انگریزی ترجمہ) کی بھی رونمائی ہوئی۔ اس ادبی ورکشاپ میں ہونے والے مباحثے اور پیش کی گئی تخلیقات کو ایک کتابی شکل میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ساتھ ہی اگلی ورکشاپ ۱۹۹۱ء بمقام کوپن ہیگن، ڈنمارک میں رکھنے کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔

یہ ادبی ورکشاپ نہ صرف بے حد کامیاب رہا بلکہ اس نے مختلف کلچر، زبان اور نسل کے قلم کاروں کو

ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب لانے کا موقع فراہم کیا۔

(جاوید دانش)

"دریچۂ شب" کی تعارفی تقریب

جدّہ میں مقیم پاکستانی شاعر اور ادیب نسیم سحر کے تیسرے مجموعے کی تعارفی تقریب سیّد ظفر مہدی کے ہاں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت تسلیم الٰہی زلفی نے اور نظامت انجم رضوی نے کی۔ اس موقع پر نسیم سحر کے بارے میں شخصی خاکے بھی پڑھے گئے اور ان کے فکر و فن کے حوالے سے "دریچۂ شب" میں شامل نظموں کے محاکمے پر مبنی مقالے بھی پیش کیے گئے۔ جدّہ میں مقیم معروف پاکستانی اور ہندوستانی شعرائے کرام نے نسیم سحر کو منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا۔ ان شعرا میں نعیم بازید پوری، ناظر قدوائی، مسرور انیس اور ظفر مہدی شامل تھے۔

اس موقع پر جناب شاعر لکھنوی کی وفات کے سلسلے میں ایک تعزیتی قرارداد بھی منظور کی گئی۔

اردو زبان کو تاحال کسی بھی سطح پر سرکاری اور عدالتی زبان نہیں بنایا گیا

لاہور، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۲۵۱ کے مندرجات کے تحت طے کر دیا گیا تھا کہ ۱۹۷۳ء سے ۸۸ء تک کے عرصے میں انگریزی زبان کو دیس نکالا دے دیا جائے گا اور جملہ ملکی امور سرکاری کاروبار قومی زبان اردو میں انجام پذیر ہوں گے۔ عدالتیں اور دیگر سرکاری ادارے اور ذمہ دار اہلکار اپنے تمام فیصلے اور احکام اردو زبان میں تحریر کریں گے مگر ۸۸ء بیت گیا بلکہ ۸۹ء کا نصف بھی بیت چکا ہے۔ ہم اردو زبان کو کسی بھی سطح پر سرکاری، عدالتی زبان نہیں بنا سکے بلکہ پاکستان کی ایک آئینی شق کی صریحاً خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار انور علیمی ایڈووکیٹ نے گزشتہ روز اپنے ایک بیان میں کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ عدالتِ عظمیٰ پاکستان اس واضح آئینی خلا کو از خود نوٹس لے کر واضح احکامات جاری کرے۔ (جنگ لاہور، ۳ ستمبر ۱۹۸۹ء)

بابائے اُردو مولوی عبدالحق — حیات اور علمی خدمات

مرتّبہ: شہاب الدّین ثاقب

قیمت: ۴۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان، بابائے اُردو روڈ۔ کراچی، ۱

حرفِ تازہ

کتابیں

تنقید اور جدید اردو تنقید ——— مصنف: ڈاکٹر وزیر آغا
تنقید
صفحات: ۲۴۸۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

مضامین اختر جوناگڑھی ——— مصنف: قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی
مضامین
صفحات: ۴۱۴ ۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

کاروانِ صحافت ——— مصنف: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
صحافت
صفحات: ۲۵۸۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

احسن مارہروی ——— مصنف: ڈاکٹر صابر حسین جلیسری
آثار و افکار
صفحات: ۴۲۴۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری ——— مصنف: قاضی عبدالغفار
فکشن
صفحات: ۲۸۴۔ قیمت: ۷۵ روپے
پتا: المسلم پبلیشرز۔ کراچی

سیلوٹ ——— مصنف: صدیق سالک
ناول
صفحات ۲۱۸ ۔ قیمت: ۹۰ روپے
پتا: مکتبہ سرمد راولپنڈی۔ پوسٹ بکس ۱۰۵۴

تماشا کہیں جسے ——— مصنف: مشکور حسین یاد
طنز و مزاح
صفحات ۱۸۴۔ قیمت: ۴۵ روپے
پتا: پولیمر پبلی کیشنز، راحت مارکٹ اردو بازار، لاہور

عسکری کے افسانے ـــــــــــ مرتبہ: محمد سہیل عمر

افسانے

صفحات: ۲۹۲ - قیمت: ۶۵ روپے

پتا: نفیس اکیڈمی اردو بازار، کراچی

محترم چہرے ـــــــــــ مصنف: ڈاکٹر انور سدید

شخصیات

صفحات: ۲۷۰ - قیمت: روپے

پتا: نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی

تین سنسکرت ڈرامے ـــــــــــ ترجمہ: ڈاکٹر سہیل بخاری

ڈرامے

صفحات: ۲۸۷ - قیمت: ۶۵ روپے

پتا: نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی

نارسائی ـــــــــــ مصنف: خالد شریف

شاعری

صفحات: ۱۱۱ - ۵۰ روپے

پتا: ماورا پبلیشرز، بہاولپور روڈ، لاہور

چپ کی صدا ـــــــــــ مصنف: یوسف مثالی

شاعری

صفحات: ۱۶۰ - قیمت: ۶۰ روپے

پتا: القمر انٹرپرائزز، رحمانی مارکٹ اردو بازار، لاہور

پرانا قالین ـــــــــــ مصنف: ابوسعید قریشی

ناول

صفحات ۲۷۶ - قیمت: ۶۵ روپے

پتا: نفیس اکیڈمی اردو بازار، کراچی

اردو ٹائپ اور ٹائپ کاری ـــــــــــ مرتبہ: علی حیدر ملک

منتخب مقالات

صفحات: ۹۹ - قیمت: ۳۲ روپے

پتا: مقتدرہ قومی زبان ۱۲ ڈی (غربی) بلیو ایریا۔ الیف ۶/۱، اسلام آباد

جریدہ

خیابان شمارہ اوّل ـــــــــــ مرتبین: رضی حیدر رضوی، حسن عباس رضا

صفحات: ۱۹۱ - قیمت: ۴۰ روپے

پتا: ۴ - بلاک ۱۰ - اے۔ سپر مارکیٹ، اسلام آباد

جنوری تا جون ۱۹۸۹ء اور دیگر مہینوں کے موضوع وار اشاریے

نئے خزانے

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

ادیب اور شاعر

جمال پانی پتی	شیخ عبدالواحد	آگہی	کراچی	مارچ	۱۹۸۹ء ص ۶۴
جمشید آفاق	عرش صدیقی سے چند باتیں	الہام	بہاول پور	اپریل	〃 ص ۲
جمیل جالبی، ڈاکٹر	جوش ملیح آبادی کے بارے میں	آگہی	کراچی	مارچ	〃 ص ۸
خالد اختر، محمد	برانٹی بہنیں	قومی زبان	〃	مئی	〃 ص ۳۷
خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا	ابوالکلام کی نثر	دائرے	〃	فروری	〃 ص ۱۰۳
خورشید الحسن رضوی، ڈاکٹر	نجیب محفوظ	فکر و نظر	اسلام آباد	جنوری	〃 ص ۸۹
ذکا صدیقی	مولانا عرشی	نیا دور	کراچی	شمارہ ۸۳،۸۴	ص ۴۲
راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر	جلیل مانک پوری	قاران	〃	فروری	۱۹۸۹ء ص ۲۲
راشد اسدی	سخنورانِ جے پور	سب رس	〃	جنوری	〃 ص ۲۵
رشید نثار	اختر ہوشیارپوری کا وجودی شعور	فیض الاسلام	راولپنڈی	〃	〃 ص ۳۴
رضا ہمدانی	رحمان بابا	ندائے افغان	ملتان	یکم مارچ	〃 ص ۳
رضی حیدر، خواجہ	انکشافِ حیات کا شاعر (سرشار صدیقی)	دائرے	کراچی	اپریل	〃 ص ۴۶
رعنا اقبال	اندھیری رات کا تنہا مسافر (شہزاد منظر)	ابلاغ	پشاور	〃	〃 ص ۴۸
رئیس احمد نعمانی	سخنورانِ فارسی ہند بعد از عہد اقبال	خدا بخش لائبریری جرنل	پٹنہ	۴۹	〃 ص ۹۵
ریاض الدین احمد	ادیب العصر ل۔ احمد	انجمن	کراچی	جون	〃 ص ۲۵
سحر انصاری	مجتبیٰ صاحب	قومی زبان	〃	مئی	〃 ص ۱۵
〃	مجنوں کی فلسفیانہ تحریریں	〃	〃	جون	〃 ص ۲۵
سرور اکبر آبادی	جگر مراد آبادی	انجمن	〃	جنوری	〃 ص ۲۷
سری نیواس لاہوٹی	ڈاکٹر زور — چند تاثرات	قومی زبان	〃	〃	〃 ص ۴۱

سعدیہ نسیم، ڈاکٹر	ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاس گنجوی	〃	〃	مئی	〃	ص ۵۱
سلیم اختر، ڈاکٹر	گیٹالٹ، نفسیات اور تخلیق	نیا دور	〃	شمارہ: ۸۳-۸۴		ص ۴۵
سیدہ جعفر، ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا تہذیبی پہلو	سب رس	〃	جنوری	۱۹۸۹ء	ص ۵
صدیقی پریمی، ڈاکٹر	راجیندر بہادر موج	کتاب نما	دہلی	فروری	〃	ص ۵۵
شاد، ریاض احمد	اسیر عابد کی ترجمہ نگاری	ادبیات	اسلام آباد	جنوری	〃	ص ۱۰۳
شاعر، حمایت علی	کمال احمد رضوی	ادبِ لطیف	لاہور	فروری	〃	ص ۷
شاہد اکبر آبادی، خان	جالب مراد آبادی	العلم	کراچی	جنوری	〃	ص ۶۹
شفا حکیم محمد حسین خاں	حضرت شاہ جمال اللہ گجراتی	سہروردی	لاہور ۸		〃	ص ۹۷
شفیق، شفیق احمد	علامہ وحشت کلکتوی	قومی زبان	کراچی	فروری	۱۹۸۹ء	ص ۵۱
شہاب دہلوی	احسان دانش — کچھ یادیں	الہام	بہاول پور	۱۴ مئی	〃	ص ۵
〃	حافظ نصیر الدین خرم	ادبیات	اسلام آباد	جنوری	〃	ص ۷۳
طاہر تونسوی، ڈاکٹر	شعورِ ذات کے منظر نامے کا شاعر (عرش صدیقی)	دائرے	کراچی	مئی	〃	ص ۱۷
طاہر مسعود	یوسف ناظم سے ایک مکالمہ	کتاب نما	دہلی	〃	〃	ص ۴۳
طاہرہ، قرۃ العین	ساغر صدیقی	ابلاغ	پشاور	اپریل	〃	ص ۱۹
ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر	حبیب احمد صدیقی بدایونی	العلم	کراچی	جنوری	〃	ص ۸۶
عارف لکھنوی	واثق ٹونکی	سب رس	〃	دسمبر	۱۹۸۸ء	ص ۲۷
عالیہ خاتون صدیقی	اسمٰعیل میرٹھی	بزمِ اردو	سڈنی	جنوری	۱۹۸۹ء	ص ۲۵
عبدالحق، مولوی	ترقی اردو بورڈ سے بابائے اردو کا استعفا	دائرے	کراچی	مئی	〃	ص ۷
عبدالحق، بابائے اردو مولوی	کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ	اردو	〃	اکتوبر	۱۹۸۸ء	ص ۱۹۱
عبدالرشید عراقی	مولانا عبدالماجد دریابادی	ندا	لاہور	۳ فروری	۱۹۸۹ء	ص ۴۰
عبدالقوی دسنوی	اعجاز صدیقی مرحوم	روحِ ادب	کلکتہ	اپریل	۱۹۸۸ء	ص ۲۳
عبداللہ، ڈاکٹر سید	شیر افضل جعفری کی شاعری	دائرے	کراچی	〃	۱۹۸۹ء	ص ۳۵
عرشی زادہ، اکبر علی خاں	فیض — اختر شیرانی کی صدائے بازگشت	کتاب نما	دہلی	جنوری	〃	ص ۲۵
عظیم ہادی	حاصل مراد آبادی	وجدان	کراچی	〃	〃	ص ۹
عنایت علی خاں، پروفیسر	آہ! مضطر دہلوی	سیارہ	لاہور ۲۷		〃	ص ۲۶۶
عنوان چشتی، پروفیسر	شاہ نصیر	کتاب نما	دہلی	جون	〃	ص ۱۱
غلام شبیر، رانا	جھنگ رنگ کے مشہور شاعر (محمد شیر افضل جعفری)	ادبِ لطیف	لاہور	جنوری	〃	ص ۳

فریدہ عفت	قراق کی عشقیہ شاعری	سب رس	کراچی	فروری	ص ۱۱
قمر جمیل (مترجم)	نارمن میلر سے ایک انٹرویو	دائرے	"	اپریل	ص ۶۰
قمر رئیس، پروفیسر	ابرار حسنی — فن اور شخصیت	کتاب نما	دہلی	مارچ	ص ۳۳
کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر	مثنویات امیر خسرو — ایک جائزہ	دائرے	کراچی	جنوری	ص ۲۱
گیلانی، بے نام	چین کا پریم چند — لوشون	روحِ ادب	کلکتہ	اپریل ۱۹۸۸ء	ص ۷۲
مجاہد حسین حسینی، پروفیسر	پروفیسر احتشام حسین — کچھ یادیں کچھ غم	ادبی کائنات	دہلی	جنوری ۱۹۸۹ء	ص ۳۵
محمد ارشد خاں	مانوس اجنبی (ناصر کاظمی)	ادبِ لطیف	لاہور	جون	ص ۵
محمد تقی، سید	حسرت کاظمی اور جدید حسیت	قومی زبان	کراچی	مئی	ص ۳۳
محمد ریاض، ڈاکٹر	عباد اللہ اختر	ادبیات	اسلام آباد	جنوری ۱۹۸۹ء	ص ۹۱
محمد سالم	مجروح سلطان پوری کی غزل گوئی	کتاب نما	دہلی	جون	ص ۳۱
محسن احسان، پروفیسر	ڈاکٹر مظہر علی خاں	سب رس	کراچی	دسمبر	۱۹۸۸ء ص ۲۲
مسعود ہاشمی، پروفیسر	استاد فاخر ہریانوی	شام و سحر	لاہور	جنوری	۱۹۸۹ء ص ۱۷
مظفر حنفی، ڈاکٹر	جوش و فراق — تضادات اور مماثلتیں	قومی زبان	کراچی	مارچ	ص ۲۱
مظفر اعظمی، ڈاکٹر	جگن ناتھ آزاد	سیارہ	لاہور ۲۷		ص ۱۶۳
منہاس، پروفیسر علی ظہیر	کشور — ایک بولڈ شاعرہ	شام و سحر	"	جنوری	ص ۲۹
منیر الدین احمد	احمد ندیم قاسمی سے گفتگو	کتاب نما	دہلی	فروری	ص ۴۹
نارنگ، گوپی چند	آنند نرائن ملا	بزمِ اردو	سڈنی	جنوری	ص ۲۸
نصرت، مجاہد حسین	سلام گوئی اور قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی	ادبی کائنات	دہلی	"	ص ۴۳
نور الحسن جعفری	کچھ تذکرہ نثار کا	دائرے	کراچی	فروری	ص ۲۴
نیاز مند، ڈاکٹر محمد صدیق	شرح احوال و آثار و سبک شعر ملا ساطع کشمیری	خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ ۴۸			۱۹۸۸ء ص ۳۶۹
نیر مسعود	شہنشاہ مرزا	قومی زبان	کراچی	جنوری	۱۹۸۹ء ص ۱۵
نیر مسعود، ڈاکٹر	کیسری کشور	"	"	اپریل	" ص ۳۷
وفا راشدی، ڈاکٹر	شبلی کا ایک تنقیدی کارنامہ	مجلہ	"	نمبر ۱	۱۹۸۸ء ص ۹۵
یوسف الدین خاں، محمد	حبیب حیدر آبادی	سب رس	"	فروری	۱۹۸۹ء ص ۲۰

تاریخی، سیاسی شخصیات

الطاف پیرزادہ	بریگیڈیر طارق محمود شہید	اخبارِ جہاں	کراچی	۵ر جون ۱۹۸۹ء ص ۹

270 Phone: 724023

QAUMI ZABAN Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

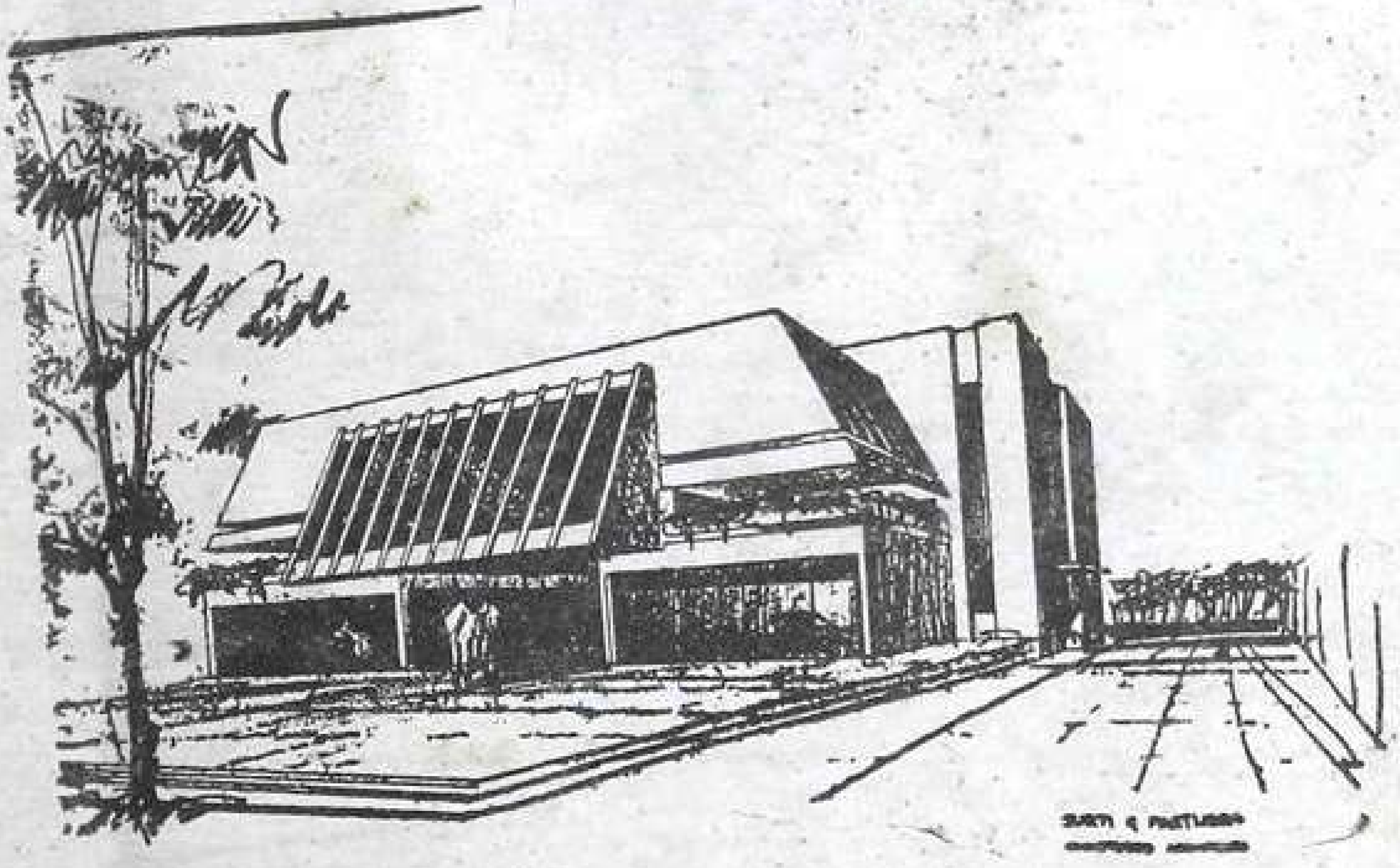

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر:۔ ادیب سہیل و محمد سراج الحق کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی
انجمن ترقی اردو (پاکستان)۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی سے شائع